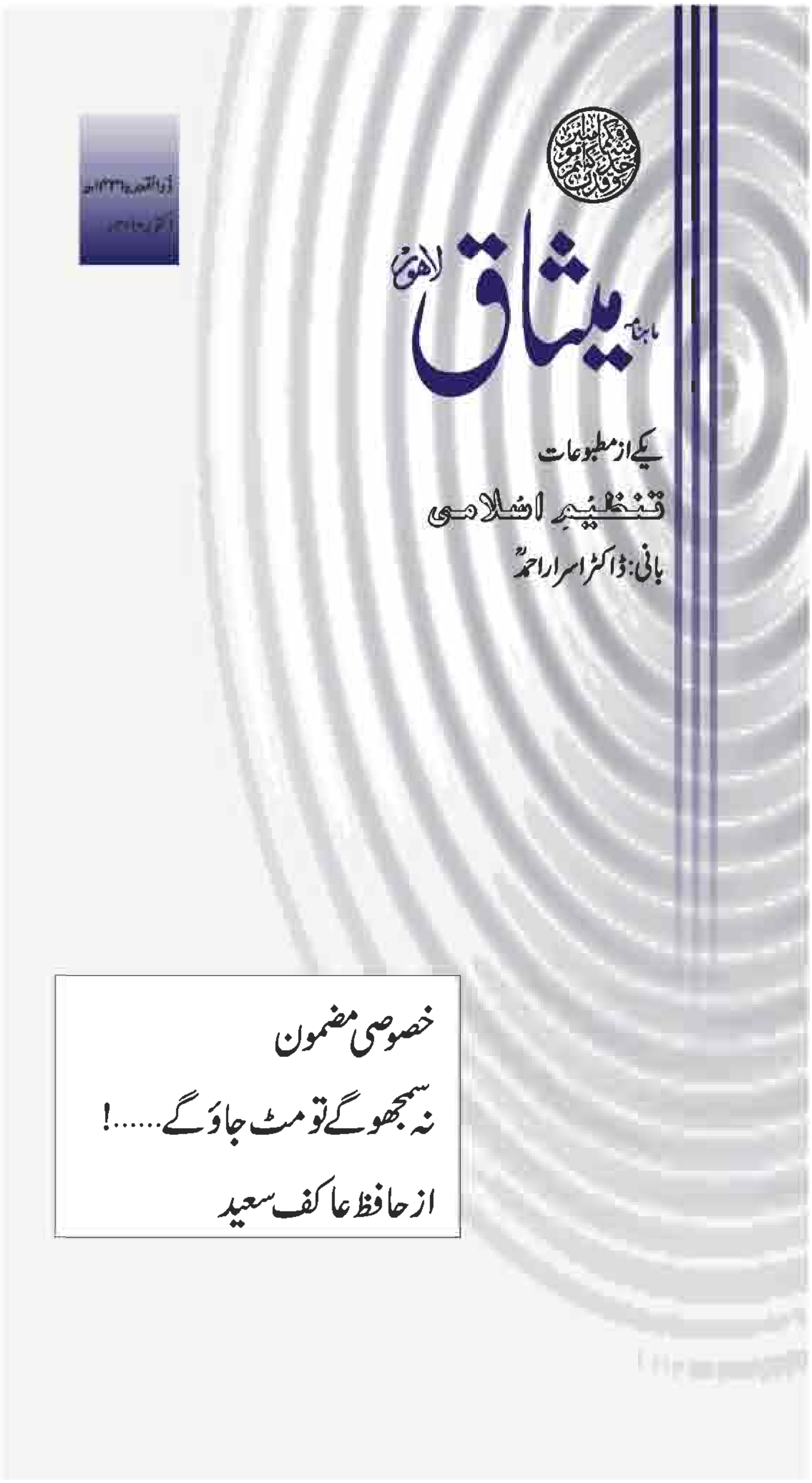
ماہنامہ
میثاق
لاہور
یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
خصوصی مضمون
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے.....!
از حافظ عاکف سعید

مشمولات

تذکرہ و تبصرہ ——— 3

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے.....! — حافظ عاکف سعید

بیانُ القرآن ——— 11

سورۃ المائدۃ (آیات ۶۷ تا ۹۳) — ڈاکٹر اسرار احمد

منتخب نصاب ۔۲ ——— 33

اقامت دین کے لیے کام کرنے
والوں کے مطلوبہ اوصاف (۲) — انجینئر نوید احمد

حقیقتِ دین ——— 55

الجہاد فی الاسلام — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسوہ و سیرت ——— 61

سیرت النبیؐ کا پیغام
اور آیتِ اظہارِ دین — حافظ محمد مشتاق ربانی

تعمیر سیرت ——— 67

غرور و تکبر — بنت محیی

یادِ رفتگاں ——— 77

ڈاکٹر اسرار احمد کی یاد میں — ریحان یوسفی

ہزاروں خواہشیں ایسی..... — جمیل الرحمٰن عباسی

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے.....!

اس مرتبہ ہلالِ عید اہل پاکستان کے لیے جن حالات میں طلوع ہوا ہے' کم سے کم الفاظ میں یہ ملکی تاریخ کا بدترین اور سنگین ترین دور ہے۔ چنانچہ عید کی خوشیاں رنج والم کے دبیز پردوں میں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک طرف ہولناک سیلاب ہے جس نے چاروں صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور دو کروڑ سے زائد افراد شدید طور پر اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ دوسری طرف مہنگائی اور گرانی کا سیلاب ہے جو تھمنے میں نہیں آ رہا۔ تیسری طرف دہشت گردی' قتل و غارت گری اور ٹارگٹ کلنگ کا عذاب ہے' جس نے امن وامان تہ و بالا کر رکھا ہے اور جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری داستانِ غم یہ بھی ہے کہ ہم سیاسی اور عسکری طور پر امریکہ اور معاشی طور پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں' اور اس غلامی کے چنگل سے چھٹکارے کی بظاہر کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ستم در ستم یہ کہ ایسے سنگین' بدترین اور ہولناک حالات میں ہمیں جو حکمران میسر آئے ہیں وہ ملی و قومی سطح کی vision سے یکسر محروم ہیں اور اتنے کوتاہ چشم واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اپنی ناک اور اپنی ذات سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ خود غرضی اور مفاد پرستی ہی اُن کا دین و ایمان ہے۔ قوم کے دکھوں کا مداوا کرنے کی بجائے وہ اپنی تجوریاں بھرنے اور صرف اپنے منظورِ نظر دوستوں کو نوازنے کو ہی ملک و قوم کی خدمت گردانتے ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا یہ صورت حال کی سنگینی کا محض ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ جو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے وہ یہ ہے کہ ملکی بقا اور سالمیت بھی آج شدید ترین خطرات سے دوچار ہے۔ ہمارے دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جل رہے ہیں۔ پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اِسے دنیا کے نقشے سے معدوم کرنے کی ان کی سازشیں اب کامیابی سے ہمکنار ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ دنیا کا واحد خطہ جس کے بارے میں اسلام دشمن طاقتوں کو اندیشہ تھا کہ وہ اسلام کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن سکتا ہے' جس کا قیام بھی معجزانہ تھا اور جس کو

ایٹمی قوّت بھی معجزانہ طور پر عطا ہوئی تھی' آج بدترین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی ملک وملت کے ساتھ غداری کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں بحران تو اگرچہ پہلے بھی آتے رہے ہیں اور بار بار کالم نگاروں اور حالات کی سمجھ رکھنے والوں نے کہا کہ ملک سنگین حالات سے دوچار ہے' لیکن یہ پہلی بار ہوا ہے کہ حالات کا فہم رکھنے والے تقریباً تمام اہلِ قلم یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان ہمارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ ملک اپنے آخری اور منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شومئی قسمت کہ ان بدترین حالات میں بھی ہم حقیقت پسندانہ انداز میں حالات کا تجزیہ کرنے اور اصلاحِ احوال کے لیے ایک قوم بننے پر آمادہ نہیں۔

بلوچستان اور کراچی میں ٹارگٹ کلنگ ملک کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ قبائلی علاقوں میں فوجی ایکشن اور پے بہ پے ڈرون حملوں کے نتیجے میں ہمارے قبائلیوں کی عظیم اکثریت' جو آج تک ہماری مغربی سرحد کے بلاتنخواہ محافظ تھے اور اسلام اور پاکستان کے وفادار تھے' آج ہماری حکومت اور پاکستانی فوج کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی ہے۔ اور یقیناً اس میں اصل غلطی ہماری ہے' وہ تو محض ردّعمل کا شکار ہیں۔

جن علاقوں میں امریکی خوشنودی کے حصول کے لیے اور امریکہ کے دباؤ پر فوجی ایکشن کیا گیا اور وہاں کے بے گناہ عوام کو دشمنوں کی طرح treat کیا گیا' جن کے مکانات مسمار کیے گئے' جہاں بے شمار بے گناہ بچے' عورتیں' جوان اور بوڑھے فوجی ایکشن کے نتیجے میں خاک و خون میں غلطاں ہوئے' یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان علاقوں کی عظیم اکثریت آج اپنے دلوں میں پاکستانی فوج کے خلاف شدید نفرت کے جذبات رکھتی ہے۔ امریکہ کا اصل ایجنڈا ابھی یہی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی نااہلی اور اپنے فرائض سے غفلت کے نتیجے میں آج عوام اور حکومت کے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہو چکی ہے۔ تازہ ترین حماقت بلوچستان کے حوالے سے ہے۔ اب بلوچستان میں پولیس کی جگہ FC کو بھیج کر امریکی ایجنڈے کی تکمیل میں ہماری حکومت بھرپور تعاون کر رہی ہے کہ بلوچستان کو پاکستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حالات ایک خوفناک خانہ جنگی اور خونی انقلاب کی طرف جا رہے ہیں اور سب کو معلوم ہے اِن حالات میں آنے والا انقلاب محض انارکی اور chaos ہی کو جنم دینے کا موجب ہوگا۔ اور ہمارے دشمن آج اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک طرف امریکی و نیٹو افواج کو اس وقت کا انتظار ہے۔

دوسری طرف بھارت بھی ایک گِدھ کی طرح ہمارے قومی مرگ کا منتظر ہے۔ دشمنوں کی پلاننگ یہی ہے کہ اس طرح کے حالات میں اس خدشے کی آڑ میں کہ کہیں ہمارے نیوکلیئر ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں' پاکستان پر امریکہ فوج کشی کر دے اور سب سے پہلے ایٹمی تنصیبات پر کنٹرول کر کے پھر پاکستان کی بندر بانٹ کی جائے۔ **اعاذ نا اللّٰہ من ذٰلك**

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں والد محترم رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ سال قبل قوم کو متوجّہ کرنے کی خاطر اس عنوان سے ایک بھرپور خطاب کیا تھا کہ ''کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے انہیں حالات دیکھنے اور سمجھنے کی خصوصی صلاحیت سے نوازا تھا۔ اقبال کے اس شعر کے حوالے سے وہ فرمایا کرتے تھے ؎

''خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف''

کہ میری دو آنکھیں قرآن و سنت ہیں جن کی روشنی میں وہ حالات کا تجزیہ کرتے اور حالات کے رُخ کو دیکھ کر آنے والی رُتوں کا پتا لگایا کرتے تھے۔ انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا۔ تحریک پاکستان میں ایک نوجوان طالب علم کے طور پر بھرپور حصہ بھی لیا تھا۔ یہ پہلی عید ہے کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے اور اُن پر رحم فرمائے۔ اُن کی سوچ بڑی واضح تھی۔ جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا' یہاں ۹۷ فیصد مسلمان رہتے ہیں مگر اس کے باوجود ۶۶ سال میں بھی ہم نے یہاں اسلام کو قائم اور شریعت کو نافذ نہیں کیا۔ ہمارا یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغاوت کے مترادف ہے۔ یہ ہمارا وہ عظیم قومی جرم ہے جس کے بعد پاکستان کی بقا کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ نائن الیون کے بعد تو ہم نے اپنے نامہ اعمال میں ایک اور جرمِ عظیم کا اضافہ کیا کہ اللہ اور اس کے دین سے غداری کرتے ہوئے افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف صلیبی' ابلیسی اور دجالی قوتوں کا فرنٹ لائن اتحادی بننا قبول کیا اور اُس اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم نہ اسلام کے وفادار ہیں اور نہ آزادی کے مستحق' بلکہ اللہ کے عذاب اور غضب کے مستحق ہیں۔ اللہ نے ہمیں معجزانہ طور پر آزادی عطا کی تھی' تاکہ دیکھے کہ ہم عملاً کیا کرتے ہیں' آیا اُس کا شکر ادا کرتے اور اُس کے دین کو نافذ کرتے ہیں یا اُس کے ساتھ غداری کرتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾

''پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا' تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔''

بہر کیف اب ہم اپنی بداعمالیوں کے سبب خود کو بدترین عذابِ الٰہی کا مستحق بنا چکے ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرانی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:٤١)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے (بُرے) اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے۔''

واضح رہے کہ زلزلوں اور سیلابوں کے ساتھ ساتھ ایسے نااہل اور بے انصاف بلکہ عدل وانصاف کے دشمن حکمرانوں کا ہمارے سروں پر مسلّط ہونا بھی عذابِ الٰہی کا مظہر ہے۔ ہم نے بحیثیت قوم اللہ کے دین اور شریعتِ محمدیؐ سے غداری کی ہے۔ یہاں تک کہ آج تک ہماری دینی جماعتوں نے بھی نفاذِ شریعت کے لیے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ (واضح رہے کہ ۱۹۷۷ء میں تحریک نظامِ مصطفیٰؐ اصلاً نفاذِ شریعت کے لیے نہیں اُٹھائی گئی تھی بلکہ یہ ایک خالص سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد بھٹو کی حکومت کو ختم کرنا تھا۔ اس کا اصل نام پی این اے تھا اور اس سیاسی تحریک پر مذہبی لبادہ محض عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اوڑھا گیا تھا) ہاں یہ ضرور ہوا کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں الیکشن کی دلدل میں پھنس کر مفادات اور مصلحتوں کا شکار رہیں اور دین کو بدنام کیا۔ ہمارے حکمران ویسے بھی اسلام اور شریعت کے دشمن ہیں۔ ہمارے عوام کو بھی شریعت کے نفاذ اور اللہ کے دین کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دنیاداری' دولت پرستی' مفاد پرستی' خودغرضی' دھوکہ' کرپشن' جھوٹ' وعدہ خلافی ہمارا قومی شعار بن چکے ہیں۔ پوری قوم سود اور جوئے میں مبتلا ہے۔ ہم اللہ کے راستے کو چھوڑ کر شیطان کے راستے پر چل رہے ہیں' حالانکہ ہمیں شیطان کے راستے پر چلنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ﴾ (البقرة:٢٠٨)

''مؤمنو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو۔''

چنانچہ موجودہ صورتحال ہمارے ان قومی جرائم کی سزا ہے جو پوری قوم کو مل رہی ہے۔ بقول اقبال ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

ہم جس امریکہ کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں' جس کی خوشنودی کی خاطر ہم نے اپنے تمام قومی و ملی مفادات کو داؤ پر لگایا ہے' اپنے دین' دینی اقدار کو اور اپنے بے گناہ شہریوں کو قربانی کی بھینٹ چڑھایا ہے' جس کے فرنٹ لائن اتحادی بن کر ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ہمارا محافظ بن جائے گا اور ہمارے قومی مفادات کا تحفّظ کرے گا' آج کون نہیں جانتا کہ وہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وکی لیکس رپورٹ جو منظر عام پر آئی ہے' کے مطابق ہمارے ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں میں بھی وہی ملوث ہے۔ ہم کتنے نادان ہیں کہ ایک معصوم بچے کی طرح بھیڑیے سے خیر کی توقع کیے بیٹھے ہیں جو ہمیں چیر پھاڑ کھانے کے بہانے تلاش کر رہا ہے۔

ان حالات میں ہمارے لیے بچاؤ کا راستہ ایک ہی ہے' اور وہ ہے قومِ یونس کی طرح اجتماعی توبہ۔ اجتماعی توبہ کا تقاضا محض یہ نہیں کہ قوم کے گنے چنے افراد توبہ کریں اور بس' بلکہ قوم کا ایک قابل ذکر حصہ توبہ کرے۔ اپنی سابقہ کوتاہیوں اور دین سے بے وفائیوں پر اظہارِ ندامت کے ساتھ توبہ و استغفار ہو' اور آئندہ اس کی تلافی کے طور پر دو کام ہوں: ایک یہ کہ انفرادی سطح پر پورے دین پر عمل کیا جائے' جیسا کہ قرآن مجید کا حکم میں آپ کو سنا چکا ہوں' اور دوسرے یہ کہ ملک میں دین حق کے قیام اور نفاذِ شریعت کے لیے اجتماعی جدّوجُہد اور کوشش کی جائے' تاکہ رحمۃ للعالمین ﷺ کا لایا ہوا وہ عظیم نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو جو پوری نوعِ انسانی کے لیے رحمت ہے اور رب کی دھرتی پر رب کے نظام کی بالادستی عملاً قائم ہو جائے۔ بچاؤ کا یہی راستہ ہے۔ ہماری محرومی اور بدنصیبی ہے کہ اعلیٰ ترین اجتماعی نظام یعنی دین حق کو چھوڑ کر ہم ایک انتہائی تعفّن زدہ اور استحصالی نظام کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جس میں نہ عدل ہے نہ انصاف' نہ امن ہے نہ امان' نہ انسانی حقوق کا کوئی لحاظ ہے' نہ انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی سامان!!!

اگر ۹۷ فیصد مسلمان آبادی میں سے ۳۰/۲۵ فیصد لوگ بھی اجتماعی توبہ کے اس راستہ پر چل پڑیں' اپنا قبلہ عملی طور پر درست کر لیں' تو اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اِن شاء اللہ' اللہ کی رحمت اور نصرت ہمارے شامل حال ہو جائے گی۔ اس ملک کو وہی ذات بچا سکتی ہے جس نے اپنی خصوصی قدرت سے یہ ملک ہمیں عطا کیا تھا۔ اللہ ہی ہمارا مولا اور کارساز ہے۔ وہ تو مائل بہ کرم ہے مگر جب ہم ہی اُس کی جانب رجوع نہ کریں تو پھر اُس کی رحمت کیسے ہمارے شامل حال ہو سکتی ہے ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں' کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں!

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا دوٹوک اعلان ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۝۷﴾ (محمد)

''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام اور قانون کو نافذ و قائم کرنے کی جدوجہد کرو گے) تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ ہمیں سنا دیا کہ:

﴿اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۶۰)

''اگر اللہ تمہارا مددگار بن جائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔''

ہمارے تمام مسائل کا حل اسی اجتماعی توبہ میں ہے۔ جان لیجئے کہ یہ دنیا کا عارضی عذاب بھی ایک اعتبار سے اللہ کی رحمت کا مظہر بن جائے گا اگر ہم اس کے ذریعے جاگ جائیں۔ اللہ کی طرف سے قوموں کو چھوٹے چھوٹے عذابوں میں مبتلا ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ وہ غفلت اور نافرمانی کی روش ترک کر کے اللہ کی طرف رجوع کر لیں۔ سورۃ الروم کی متذکرہ بالا آیت (۴۱) میں جہاں فساد و تباہی کو انسانی ہاتھوں کی کمائی بتایا گیا' وہاں آخر میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اللہ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو جگانا چاہتا ہے۔ ﴿لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ ''تاکہ وہ (لوگ اللہ کی طرف) پلٹ آئیں۔'' یاد رکھئے' اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو تباہی ہی ہمارا مقدر ہوگی' اور یہ تو دنیوی عذاب ہے' اصل پکڑ تو آخرت کی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ ہم جس راستے پر گامزن ہیں وہ دُنیوی و اُخروی خسارے کا راستہ ہے' اور جس راستے کی طرف ہمارا دین بلاتا ہے وہ دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ ہے۔

آخری بات:

ناامیدی کے اندھیروں میں امید کی ایک روشن کرن بھی دکھائی دے رہی ہے' اور یہ کرن پڑوس کی سرزمین سے آ رہی ہے۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے ہیں' دوسروں سے سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں' کیا گزشتہ ۹ برس کے دوران ہمارے برابر کی سرزمین میں ہونے والے عظیم معرکہ حق و باطل میں ہمیں کوئی سبق نظر نہیں آتا؟ کیا تمام تر بے سروسامانی

کے باوجود طالبان کی بے مثال مزاحمت اور ٹیکنالوجی کی تمام تر برتری اور نہایت مہلک اور جدید ترین اسلحے سے لیس امریکہ اور NATO افواج کی شکست سے ہم کچھ بھی سبق سیکھنے کو تیار نہیں؟ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستان اور افغانستان دونوں امریکہ کا ٹارگٹ تھے۔ افغانستان پر مسلّط کردہ امریکی جنگ کے موقع پر ہم نے دینی اعتبار سے بے غیرتی' بے حمیتی بلکہ صحیح تر الفاظ میں اللہ اور اس کے دین سے بغاوت کے راستے کو ترجیح دی' ایٹمی قوت ہوتے ہوئے امریکہ کے غلط اور ناجائز مطالبے کے مقابلے میں سٹینڈ لینے کی بجائے اس کے سامنے سربسجود ہونے کو ترجیح دی' اور اللہ کو اکبر تسلیم کرنے کی بجائے امریکہ کو ''اکبر'' مان لینے میں عافیت محسوس کی۔ نو برس کے بعد نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں کہ سو پیاز کھانے کے بعد اب سو جوتے بھی کھانے پڑ رہے ہیں۔ ساری دنیا گِدھوں کی طرح ہمارے آخری انجام کی منتظر ہے۔ (حالیہ سیلاب میں امریکہ کی جانب سے مدد کے پردے میں جو بے حساب میرین بھیجے گئے ہیں' بے شمار نفری اور بے شمار اسلحہ بھیجا گیا ہے' اس کا مقصد کیا ہے؟) اور وہ غیور افغان جو بالکل نہتے تھے' ایٹم بم تو درکنار جن کے پاس طیارہ شکن گنیں بھی نہیں تھیں' صرف سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران استعمال ہونے والے کچھ بچے کھچے بوسیدہ اور زنگ آلود ہتھیار رکھے تھے' یہ چند ہزار اللہ کے وفادار مجاہدین تھے اور ساری دنیا اُن کی مخالف تھی۔ پورا عالم کفر خوفناک ٹیکنالوجی کی قوت کے ساتھ اُن پر حملہ آور ہوا۔ امریکہ اور نیٹو اپنی ٹیکنالوجی کی برتری کے غرور کے ساتھ آئے تھے۔ یاد کیجئے! مشرف کی یہ بات کہ یہ زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی بات ہے' طالبان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ امریکہ اور اتحادیوں نے طالبان کی حکومت ختم کر دی' اور اس کے خاتمے میں ہم نے شرمناک کردار ادا کیا' مگر طالبان کی مزاحمت کا کوئی توڑ نہیں کیا جا سکا۔ اُنہیں شکست نہیں دی جا سکی۔ آج وہی امریکہ اور نیٹو جو غراتے ہوئے آئے تھے شکست کے زخم چاٹ رہے ہیں اور وہی طالبان جو بے سروسامان تھے سرخرو ٹھہرے ہیں' اور ان شاء اللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ اور یہ بات آج ساری دنیا کہہ رہی ہے۔ وجہ کیا ہے؟ طالبان نے صرف خدائے واحد کی ذات پر توکل کیا' اُسی کے بھروسے پر امریکہ کے خلاف سٹینڈ لیا۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے وفادار تھے' لہٰذا اللہ نے اُن کی نصرت فرمائی۔ ان کی قیادت الحمدللہ آج بھی محفوظ ہے۔ ان کی قوت پہلے سے کہیں بڑھ چکی ہے۔ پبلک سپورٹ پہلے سے بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ میک کرسٹل بڑے غرور سے

افغانستان آیا تھا' لیکن پے در پے شکستوں نے اسے نیم پاگل کر دیا اور وہ ہذیان بکتا ہوا رخصت ہوا۔ اب پیٹریاس آئے ہیں۔ دعوے تو یہ کیے جا رہے ہیں کہ طالبان کی کمر توڑ دی ہے' مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ امریکہ افغانستان سے دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہے۔ ہماری پستی اور خود شکستگی کا یہ عالم ہے کہ شکست خوردہ امریکہ کی خوشامد کر رہے ہیں کہ ہمیں بے آسرا چھوڑ کر مت جاؤ۔ بحمدِ اللہ' افغانستان میں امریکہ کی شکست اُس کا مقدر بن چکی ہے۔ یہ نوشتہ دیوار ہے۔ اور جہاں تک پاکستان کے مستقبل کا سوال ہے تو یہ بظاہر نہایت تاریک ہے۔ تاہم مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ والدِ محترم کا وہ خواب پورا ہوگا جو انہوں نے بہت پہلے دیکھا تھا کہ خراسان کے علاقے میں اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی' جو عالمی سطح پر غلبۂ اسلام کی تمہید بن جائے گی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان اور افغانستان مل کر اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنیں۔ دیکھیں' پاکستان کا مقدر کیا ہے۔ ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

صحیح احادیث میں خبریں موجود ہیں کہ قیامت سے قبل کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا' اور دجّالی قوتوں کو مکمل شکست ہو کر رہے گی۔ سرزمین افغانستان سے اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ وہاں شریعت کے نفاذ سے جو برکت آئی تھی وہ بھی کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ اور اب دوبارہ ان شاء اللہ العزیز وہاں دین اسلام کی حکومت ہوگی' اور یہ عالمی غلبۂ اسلام کا نقطہ آغاز ہوگا' ان شاء اللہ۔ عید کے پیغام کے طور پر میں علامہ اقبال کے یہ دو اشعار پیش کر رہا ہوں ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

اور

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سچے اور پکے مؤمن کا کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(حافظ عاکف سعید کا خطابِ عید)

سُورۃُ المائدۃ

آیات ۶۷ تا ۷۷

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ
رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَقَدْ
اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا
اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ
مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ
وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ
وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ
لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا
يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ قُلْ يٰۤاَهْلَ
الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ
ع ۱۱ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝

آیت ۶۷ ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ ''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے۔''

﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ ''اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت سخت آیت ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اگر وحی میں کہیں رسول اللہ ﷺ پر تنقید نازل ہوئی ہے تو وہ بھی قرآن میں جوں کی توں موجود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ایسی چیزوں کو چھپا لیا گیا ہو۔ تیسویں پارے میں سورۃ عبس کی ابتدائی آیات ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى ۝١ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢﴾ بھی ویسے ہی موجود ہیں جیسے نازل ہوئی تھیں۔ سورۂ آل عمران میں بھی ہم پڑھ کر آئے ہیں کہ حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ.....﴾ (آیت ۱۲۸)۔ اس طرح کی آیات اپنی جگہ پر من وعن موجود ہیں' اور یہ قرآن کے محفوظ من اللہ ہونے پر حجت ہیں۔ آیت زیر نظر میں تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ وحیٔ الٰہی میں سے کوئی چیز کسی وجہ سے پہنچنے سے رہ نہ جائے۔ لوگوں کے خوف سے یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے بالفرض اگر ایسا ہوا تو گویا آپ ﷺ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کا ثبوت دیں گے۔ اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی' وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ!

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ﴾ ''اور اللہ آپؐ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے۔'' آپ کو لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٦٧﴾ ''یقیناً اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

آیت ۶۸ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ﴾ ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اے کتاب والو تم کسی چیز پر نہیں ہو''

تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے' کوئی مقام نہیں ہے' کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے' تم ہم سے ہم کلام ہونے کے مستحق نہیں ہو۔

﴿حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ نازل کیا گیا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔''

اب اپنے لیے اس آیت کو آپ اس طرح پڑھ لیجیے: ''يٰٓاَهْلَ الْقُرْآنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْآنَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' اے قرآن کے ماننے والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں..... تم سمجھتے ہو کہ ہم اُمتِ مسلمہ ہیں' اللہ والے ہیں' اللہ کے لاڈلے اور پیارے ہیں' اللہ کے رسولؐ کے اُمّتی ہیں۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ذلّت وخواری تمہارا مقدّر بنی ہوئی ہے' ہر طرف سے تم پر یلغار ہے' عزّت و وقار نام کی کوئی شے تمہارے پاس نہیں رہی۔ تم کتنی ہی تعداد میں کیوں نہ ہو' دنیا میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں' اور اس سے زیادہ بے توقیری کے لیے بھی تیار رہو۔ ''تمہاری کوئی اصل نہیں جب تک تم قائم نہ کرو قرآن کو اور اس کے ساتھ جو کچھ مزید تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے''۔ قرآن وحی جلی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے بھی تو احکامات ملتے تھے اور سنتِ رسولؐ وحی خفی کا ظہور ہی تو ہے۔ تو جب تک تم کتاب وسنت کا نظام قائم نہیں کرتے' تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ''يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ'' کا خطاب خود حضور ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں یہ حدیث موجود ہے جس میں حضور ﷺ سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ' وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ' وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ))(۱)

''اے اہل قرآن' قرآن کو اپنا تکیہ نہ بنالینا' بلکہ اسے پڑھا کرو رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی' جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے' اور اسے عام کرو

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان' عن عبيدة المُلَيكي۔ مشكاة المصابيح' كتاب فضائل القرآن' باب آداب التلاوة ودروس القرآن۔

اور خوش الحانی سے پڑھو اور اس میں تدبر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ) جو کچھ آپؐ پر نازل کیا گیا ہے آپؐ کے رب کی طرف سے یہ ان کے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں یقیناً اضافہ کرے گا۔''

ان کی سرکشی اور طغیانی میں اور اضافہ ہوگا' ان کی مخالفت اور بڑھتی چلی جائے گی' حسد کی آگ میں وہ مزید جلتے چلے جائیں گے۔

﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸﴾ ''تو آپؐ ان کافروں کے بارے میں افسوس نہ کریں۔''

نبی چونکہ اپنی اُمت کے حق میں نہایت رحیم و شفیق ہوتا ہے لہٰذا وہ لوگوں پر عذاب کو پسند نہیں کرتا اور قوم پر عذاب کے تصور سے اسے صدمہ ہوتا ہے۔ پھر خصوصاً جب وہ اپنی برادری بھی ہو' جیسا کہ بنی اسماعیلؑ تھے' تو یہ رنج و صدمہ دو چند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب ان کے بارے میں سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں عذاب کی خبریں آ رہی تھیں تو آپؐ بہت فکرمند اور غمگین ہوئے اور آپؐ کے بالوں میں یک دم سفیدی آ گئی۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا' حضور (ﷺ) کیا ہوا؟ آپؐ پر بڑھاپا طاری ہو گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا))(۱) ''مجھے سورۂ ہود اور اس کی بہنوں (ہم مضمون سورتوں) نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ کیونکہ ان سورتوں کا انداز ایسا ہے کہ جیسے اب مہلت ختم ہوا چاہتی ہے اور عذاب کا دھارا چھوٹنے ہی والا ہے۔

آیت ۶۹ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى﴾ ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' اور وہ لوگ جو یہودی' صابی' اور نصاریٰ (عیسائی) ہوئے''

اس آیت میں تقریباً وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع (آیت ۶۲) میں آ چکا ہے' جس سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ شاید نجات کے لیے ایمان بالرسالت کی ضرورت نہیں ہے' حالانکہ سورۃ النساء (آیات ۱۵۰' ۱۵۱ اور ۱۵۲) میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے مابین تفریق کرنے والوں کے لیے بہت واضح انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ

(۱) مشكاة المصابيح' كتاب الرقاق' باب البكاء والخوف' بحواله الترمذى ـ سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانى ۲/۶۴۱ و ۶۴۲۔

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ ''وہی لوگ تو پکے کافر ہیں۔'' دوسری بات یہاں ذہن میں یہ رکھیے کہ ان تمام سورتوں میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت قدم قدم پر ہے' بار بار ہے' لہٰذا اس سے استغناء کا کوئی جواز رہتا ہی نہیں' سوائے اس کے کہ کسی کی نیت میں فساد ہو اور دل میں کجی پیدا ہو چکی ہو۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۹﴾ ''(اپنے اپنے زمانے میں جس قوم اور جس گروہ سے) جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اُس نے اچھے عمل کیے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے۔''

یہاں وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اپنے اپنے دور میں اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین رکھتے تھے اور اپنے وقت کے نبی اور گزشتہ انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام سے ماقبل زمانہ میں یہودی تھے' جو کتاب اللہ تورات پر یقین رکھتے تھے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے' دوسرے نبیوں کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے۔ لیکن عمل کے معاملے میں اصل چیز اور اصل بنیاد اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی جزا طلبی ہے' جس سے کوئی عمل' عملِ صالح بنتا ہے۔

آیت ۷۰ ﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ﴾ ''ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔''

یہاں بہت سے رسول بھیجنے سے مراد ہے بہت سے انبیاء بھیجے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' قرآن مجید میں رسول کا لفظ نبی کی جگہ استعمال ہوا ہے' البتہ جہاں تک لفظ رسول کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں رسول صرف ایک آئے ہیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام' باقی سب نبی تھے۔

﴿كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ﴾ ''(لیکن) جب بھی کبھی ان کے پاس کوئی رسول لے کر آیا وہ چیز جو ان کی خواہشاتِ نفس کے خلاف تھی''

﴿فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝۷۰﴾ ''تو ایک گروہ کو انہوں نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔''

آیت ۷۱ ﴿وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ ''اور انہوں نے سمجھا کہ ان پر کوئی پکڑ نہیں

آئے گی‘‘

کوئی عقوبت نہیں ہوگی‘ ہم پر کوئی سرزنش نہیں ہوگی۔

﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا﴾ ’’تو وہ بہرے بھی ہوگئے‘ اندھے بھی ہوگئے‘‘

﴿ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ’’پھر اللہ نے انہیں معاف کر دیا‘‘

اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں فوراً نہیں پکڑا۔ انہیں توبہ کی مہلت دی‘ موقع دیا۔

﴿ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ﴾ ’’(نتیجہ یہ ہوا کہ) پھر ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔‘‘

بجائے اللہ کے دامنِ رحمت میں آنے کے اپنی گمراہی میں اور بڑھتے چلے گئے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ’’اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔‘‘

آیت ۷۲ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ﴾ ’’یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے۔‘‘

یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے اسی سورۃ کی آیت ۱۷ میں آ چکی ہے‘ یعنی اللہ ہی نے مسیح علیہ السلام کی شخصیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

﴿وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ﴾ ’’جبکہ مسیحؑ نے تو کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل‘ بندگی اور پرستش کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے۔‘‘

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ ’’یقیناً جو بھی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اُس پر جنت کو حرام کر دیا ہے‘‘

﴿وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾﴾ ’’اور اُس کا ٹھکانہ آگ ہے‘ اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔‘‘

اب عیسائیوں کے شرک کی ایک دوسری شکل کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان کا ایک عقیدہ تو God incarnate کا تھا۔ یہ ان میں سے ایک فرقے Jacobites کا عقیدہ تھا کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے عیسیٰؑ کی شکل میں انسانی روپ دھار لیا ہے۔ اوپر اسی عقیدے کا ذکر ہوا ہے‘ لیکن

عیسائیوں کے ہاں ایک عقیدہ ''تثلیث'' کا بھی ہے' اور اس عقیدہ کی بھی ان کے ہاں دو شکلیں ہیں۔ ابتدا میں جو تثلیث تھی اس میں اللہ' حضرت مریم اور حضرت مسیح شامل تھے۔ یعنی "God the Father, God the Mother and God the Son." دراصل یہ تثلیث مصر میں فراعنہ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اسی کے اندر انہوں نے عیسائیت کو ڈھال دیا' تاکہ مصر کے لوگ آسانی سے عیسائیت قبول کر لیں۔ اس کے بعد حضرت مریم کو اس تثلیث میں سے نکال دیا گیا اور Holy Ghost یا Holy Spirit (روح القدس) کو ان کی جگہ شامل کر لیا گیا اور اس طرح "God the Father, God the Son and God the Holy Ghost" پر مشتمل تثلیث وجود میں آئی۔

آیت ۷۳ ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ ﴾ ''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔''

﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ﴾ ''جبکہ حقیقتاً نہیں ہے کوئی الٰہ سوائے ایک ہی الٰہ کے۔''

﴿وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''اور اگر یہ باز نہ آئے اس سے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں''

﴿لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾﴾ ''تو ان میں سے جو کافر ہیں ان پر بہت دردناک عذاب آ کر رہے گا۔''

آیت ۷۴ ﴿اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ﴾ ''تو کیا یہ لوگ اللہ کی جناب میں توبہ اور اس سے استغفار نہیں کرتے؟''

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾﴾ ''اور اللہ تو غفور اور رحیم ہے۔''

آیت ۷۵ ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ﴾ ''مسیح ابنِ مریم اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک رسول تھے۔''

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾ ''ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔''

یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جو سورۂ آل عمران (آیت ۱۴۴) میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آئے ہیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾

''محمد (ﷺ) اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں' اور آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں''۔ تو اسی طرح فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیثیت اللہ کے ایک رسول کی ہے' جس طرح ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔

﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ﴾ ''اور ان کی والدہ صِدّیقہ تھیں۔''

قبل ازیں ہم سورۃ النساء (آیت ۶۹) میں پڑھ چکے ہیں کہ نبیوں کے بعد سب سے اونچا درجہ صدیقین کا ہے۔ خواتین کو اگرچہ نبوت تو نہیں ملی ہے لیکن انبیاء کے بعد کا جو دوسرا درجہ ہے اس میں بہت چوٹی کی حیثیتیں انہیں ملی ہیں۔ ہماری امّت کی صدّیقۃ الکبریٰ یعنی سب سے بڑی صدیقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں اور صدیق اکبر کی حیثیت اس اُمت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ملی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی صدیقہ ہیں۔ اسی طرح حضرت مریمؑ بھی صدّیقہ تھیں۔

﴿كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ﴾ ''دونوں کھانا کھاتے تھے۔''

دونوں انسان تھے' بشر تھے اور سارے بشری تقاضے ان کے ساتھ تھے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۷۵﴾ ''دیکھو' کس طرح ہم ان کے لیے اپنی آیات واضح کرتے ہیں' پھر دیکھو کہ وہ کہاں سے الٹا دیے جاتے ہیں۔''

آیت ۷۶ ﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ﴾ ''آپؐ کہیے کیا تم پوجتے ہو اللہ کے سوا انہیں جو تمہارے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نفع کا؟''

﴿وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶﴾ ''جبکہ اللہ ہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

آیت ۷۷ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ ''کہہ دیجیے اے اہلِ کتاب' اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو''

یہ تم نے حضرت عیسٰیؑ کو محبت اور عقیدت کی وجہ سے جو کچھ بنا دیا ہے' وہ سراسر مبالغہ ہے۔ حضور ﷺ کی شان میں بھی مبالغہ آرائی اگر لوگ کرتے ہیں تو محبت کی وجہ سے کرتے ہیں' عشقِ رسول ﷺ کے نام پر کرتے ہیں' عقیدت کے غلو کی وجہ سے کرتے ہیں۔ تو غلو (مبالغہ)

درحقیقت انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے منع کیا جارہا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور مت پیروی کرو اُن لوگوں کی بدعات کی جو تم سے پہلے (خود بھی) گمراہ ہوئے''

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' یہ تثلیث مصر میں زمانۂ قدیم سے موجود تھی' اسی کو انہوں نے اختیار کیا۔

﴿وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ ''اور انہوں نے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

آیات ۷۸ تا ۸۶

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاۗءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ ع ۱۱ ۹

آیت ۷۸ ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ﴾ ''لعنت کی گئی اُن لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے' داؤدؑ کی زبان سے اور عیسیٰؑ ابنِ مریم کی زبان سے بھی۔''

بنی اسرائیل کا جو کردار رہا ہے اس پر ان کے انبیاء ان کو مسلسل لعن طعن کرتے رہے ہیں۔Old Testament میں حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے سے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔New Testament (گوسپلز) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے تنقیدی فرمودات بار بار ملتے ہیں' جن میں اکثر ان کے علماء' احبار اور صوفیاء مخاطب ہیں کہ تم سانپوں کے سنپولیے ہو۔ تمہارا حال ان قبروں جیسا ہے جن کے اوپر تو سفیدی پھری ہوئی ہے' مگر اندر گلی سڑی ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنے اوپر صرف مذہبی لبادے اوڑھے ہوئے ہیں' لیکن تمہارے اندر خیانت بھری ہوئی ہے۔ تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو' یعنی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تو زوردار بحثیں ہوتی ہیں جبکہ بڑے بڑے گناہ کھلے بندوں کرتے ہو۔ یہ تو یہودی قوم اور ان کے علماء کے کردار کی جھلک ہے ان کے اپنے نبی کی زبان سے' مگر دوسری طرف یہی نقشہ بعینہٖ آج ہمیں اپنے علماءِ سُوء میں بھی نظر آتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۸﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی' اور وہ حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔''

آیت ۷۹ ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ﴾ ''یہ لوگ ایک دوسرے کو نہیں روکتے تھے ان منکرات سے جو وہ کرتے تھے۔''

جس معاشرے سے نہی عن المنکر ختم ہو جائے گا' وہ پورا معاشرہ سنڈاس بن جائے گا۔ یہ تو گویا انتظامِ صفائی ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے اردگرد نگاہ رکھے' ایک دوسرے کو روکتا رہے کہ یہ کام غلط ہے' یہ مت کرو! جس معاشرے سے یہ تنقید اور احتساب ختم ہو جائے گا' اس کے اندر لازماً خرابی پیدا ہو جائے گی۔

﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۹﴾ ''بہت ہی برا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔''

آیت ۸۰ ﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''تم ان میں سے اکثر کو

دیکھو گے کہ وہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں۔''

خود کافروں کے حمایتی بنتے ہیں اور اپنے لیے ان کی حمایت تلاش کرتے ہیں۔

﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ ''بہت ہی بُری کمائی ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے''

یہ ان کے جو کرتوت ہیں وہ سب آگے اللہ کے ہاں جمع ہو رہے ہیں اور ان کا وبال ان پر آئے گا۔

﴿اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''یہ کہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا ان پر''

﴿وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰﴾ ''اور وہ عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۸۱ ﴿وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ﴾ ''اور اگر یہ ایمان لاتے اللہ پر اور نبیؐ پر اور اس پر جو نبیؐ پر نازل کیا گیا (یعنی قرآن حکیم)''

﴿مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ ''تو پھر انہوں نے اِن (کافروں) کو اپنا ولی نہ بنایا ہوتا''

﴿وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۱﴾ ''لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۸۲ ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾ ''تم لازماً پاؤ گے اہلِ ایمان کے حق میں شدید ترین دشمن یہود کو اور ان کو جو مشرک ہیں۔''

یہ بہت اہم آیت ہے۔ مکہ کے مشرکین بھی مسلمانوں کے دشمن تھے' لیکن ان کی دشمنی کم از کم کھلی دشمنی تھی' ان کا دشمن ہونا بالکل ظاہر و باہر تھا' وہ سامنے سے حملہ کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں سے بدترین دشمنی یہود کی تھی' وہ آستین کے سانپ تھے اور سازشی انداز میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مشرکینِ مکہ سے کہیں آگے تھے۔ آج بھی یہود اور ہنود مسلمانوں کی دشمنی میں سب سے آگے ہیں' کیونکہ اس قسم (بت پرستی) کا شرک تو اب صرف ہندوستان میں رہ گیا ہے' اور کہیں نہیں رہا۔ ہندوستان کے بھی اب یہ صرف نچلے طبقے میں ہے جبکہ عام طور پر اوپر کے طبقے میں نہیں ہے۔ لیکن بہرحال اب بھی مسلمانوں کے خلاف یہود اور ہنود کا گٹھ جوڑ ہے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ﴾ ''اور تم لازماً پاؤ گے مودّت کے اعتبار سے قریب ترین اہلِ ایمان کے حق میں اُن لوگوں کو

جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔''

یہ تاریخی حقیقت ہے اور سیرتِ محمد ﷺ سے ثابت ہے کہ جس طرح کی شدید دشمنی اُس وقت یہود نے آپ ﷺ سے کی ویسی نصاریٰ نے نہیں کی۔ حضرت نجاشیؓ (شاہِ حبشہ) نے اُس وقت کے مسلمان مہاجروں کو پناہ دی' مقوقس (شاہِ مصر) نے بھی حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیے بھیجے۔ ہرقل نے بھی حضور ﷺ کے نامۂ مبارک کا احترام کیا۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ اگر میری پوری قوم مان لے تو ہم اسلام قبول کر لیں۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' جس کا ذکر سورۂ آل عمران (آیت ۶۱) میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر ان کا رویہ انتہائی محتاط رہا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مخالفت میں وہ شدت نہ تھی جو یہودیوں کی مخالفت میں تھی۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ ''یہ اس لیے کہ ان (عیسائیوں) میں عالم بھی موجود ہیں اور درویش بھی اور (اس لیے بھی کہ) وہ تکبر نہیں کرتے۔''

یعنی عیسائیوں میں اُس وقت تک علمائے حق بھی موجود تھے اور درویش راہب بھی جو واقعی اللہ والے تھے۔ بحیرہ راہب عیسائی تھا جس نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچانا تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی سب سے پہلے تصدیق کی تھی اور بتایا تھا کہ اے محمد (ﷺ) آپ پر وہی ناموس نازل ہوا ہے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) پر نازل ہوا تھا۔ ورقہ بن نوفل تھے تو عرب کے رہنے والے' لیکن وہ حق کی تلاش میں شام گئے اور عیسائیت اختیار کی۔ وہ عبرانی زبان میں تورات لکھا کرتے تھے۔ یہ اُس دور کے چند عیسائی علماء اور راہبوں کی مثالیں ہیں۔ لیکن وہ قِسِّيسِين اور رُهْبان اب آپ کو عیسائیوں میں نہیں ملیں گے' وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد جو صورتِ حال بدلی ہے اور صلیبی جنگوں کے اندر عیسائیت نے جو وحشت و بربریّت دکھائی ہے' اور عیسائی علماء اور مذہبی پیشواؤں نے جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے اور اپنی قوم سے اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دلوائے ہیں وہ تاریخ کے چہرے پر بہت ہی بدنما داغ ہے۔

آیت ۸۳ ﴿وَاِذَا سَمِعُوْٓا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ﴾ ''اور جب انہوں نے سنی وہ چیز جو کہ رسول (ﷺ) پر نازل کی گئی تھی''

﴿تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ ''تو تم دیکھتے ہو کہ حق کی جو پہچان انہیں حاصل ہوئی اس کے زیر اثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔''

یہ ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ مکّی دَور میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے تو ان کے ذریعے سے وہاں کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پھر جب مدینہ منورہ میں اسلام کا غلبہ ہو گیا اور عرب میں امن قائم ہو گیا تو ان کا ایک وفد مدینہ آیا جو ستر (۷۰) افراد پر مشتمل تھا اور اس میں کچھ نو مسلم بھی شامل تھے۔ آیت زیر نظر میں اس وفد کے ارکان کا ذکر ہے کہ جب انہوں نے قرآن سنا تو حق کو پہچان لینے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۳﴾ ''(اور) وہ کہہ رہے ہیں' اے ہمارے ربّ ہم ایمان لے آئے' پس تو ہمیں لکھ لے گواہی دینے والوں میں سے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ ''اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہم تک پہنچ گیا ہے''

﴿وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۴﴾ ''اور ہمیں تو بڑی خواہش ہے کہ داخل کرے ہمیں ہمارا ربّ نیکوکار لوگوں کے ساتھ۔''

آیت ۸۵ ﴿فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ ''تو اللہ نے ان کے اس قول کے بدلے انہیں وہ باغات عطا کیے جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں' جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۵﴾ ''اور یہی بدلہ ہے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا۔''

جو خوش قسمت نفوس اسلام قبول کریں' اور اسلام کے بعد ایمان اور پھر ایمان سے آگے بڑھ کر احسان کے درجے تک پہنچ جائیں ان کا بدلہ یہی ہے۔

آیت ۸۶ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٨٦﴾﴾

''رہے وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور جھٹلا دیا ہماری آیات کو' تو وہی لوگ ہیں جو جہنمی ہیں۔''

آیات ۸۷ تا ۹۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا
اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ
وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ
مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ
اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ
ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿٩٢﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا
اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ ع ۱۲

کھانے پینے کی چیزوں میں حِلّت وحرمت اور تحلیل وتحریم الہامی شریعتوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی بار بار ان مسائل پر بحث کی گئی ہے اور یہ موضوع سورۃ

البقرۃ سے مسلسل چل رہا ہے۔ عربوں کے ہاں نسل در نسل رائج مشرکانہ اوہام کی وجہ سے بہت سی چیزوں کے بارے میں حلّت وحرمت کے غلط تصورات ذہنوں میں پختہ ہو چکے تھے۔ اس قسم کے خیالات ذہنوں' دلوں اور مزاجوں سے نکلنے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے بار بار ان مسائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

آیت ۸۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اے ایمان والو' نہ حرام ٹھہرالو ان چیزوں کو جن کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے''

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ﴾ ''اور حد سے تجاوز نہ کرو۔''

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تقویٰ کے جوش میں اور بہت زیادہ نیکی کمانے کے جذبے میں بھی کئی حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر بیٹھتے ہیں' اس لیے فرمایا گیا کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷﴾ ''یقیناً اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۸۸ ﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠﴾ ''اور کھاؤ اُن حلال اور پاکیزہ چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں''

یعنی وہ چیزیں جو قانونی طور پر حلال ہوں اور ظاہری طور پر بھی صاف ستھری ہوں۔

﴿وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸﴾ ''اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو جس پر تمہارا ایمان ہے۔''

آیت ۸۹ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں''

قسموں کے سلسلے میں سورۃ البقرہ (آیت ۲۲۵) میں ہدایات گزر چکی ہیں' اب یہاں اس ضمن میں آخری حکم آ رہا ہے۔ یعنی ایسی قسمیں جو بغیر کسی ارادے کے کھائی جاتی ہیں' ان پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جیسے واللہ' باللہ وغیرہ کا تکیہ کلام کے طور پر استعمال عربوں کی خاص عادت تھی اور آج بھی ہے۔ ظاہر ہے اس کو سن کر کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ شخص باقاعدہ قسم کھا رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ﴾ ''لیکن وہ (ضرور) مؤاخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے۔''

عَقَّدْتُّم عقد سے بابِ تفعیل ہے۔ یعنی پورے اہتمام کے ساتھ ایک بات طے کی گئی اور اس پر کسی نے قسم کھائی۔ اب اگر ایسی قسم ٹوٹ جائے یا اس کو توڑنا مقصود ہو تو اس کا کفّارہ ادا کرنا ہوگا۔

﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ ''سو اس کا کفّارہ ہے کھانا کھلانا دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو''

﴿اَوْ كِسْوَتُهُمْ﴾ ''یا ان کو کپڑے پہنانا''

﴿اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ﴾ ''یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔''

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ﴾ ''پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔''

یعنی اگر کسی کے پاس ان تینوں میں سے کوئی صورت بھی موجود نہ ہو' کوئی شخص خود فقیر اور مفلس ہو' اس کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھ لے۔

﴿ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ﴾ ''یہ کفّارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔''

﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔''

یعنی جب کسی صحیح معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے' اور اگر کسی وجہ سے قسم توڑنے کی نوبت آ جائے تو اسے توڑنے کا باقاعدہ کفارہ دیا جائے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾﴾ ''اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

اب شراب اور جوئے کے بارے میں بھی آخری حکم آ رہا ہے۔

آیت ۹۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۹۰﴾ ''اے اہلِ ایمان' یقیناً شراب اور جُوا' بُت اور پانسے' یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل میں سے' تو ان سے بچ کر رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

شراب اور جوئے کے بارے میں تو پہلے بھی حکم آ چکا ہے' لیکن ''اَنصاب'' اور ''اَزلام'' کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے۔ اَنصاب سے مراد بتوں کے استھان ہیں اور اَزلام جوئے ہی کی ایک قسم تھی جس میں اہلِ عرب تیروں کے ذریعے پانسے ڈالتے تھے' قرعہ اندازی کرتے تھے۔ ان تمام کاموں کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دے دیا گیا۔

آیت ۹۱ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے شراب اور جُوئے کے ذریعے سے''

یہ بہت اہم بات ہے' کیونکہ شراب کے نشے میں انسان اپنا ہوش اور شعور کھو بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو کچھ خبر نہیں رہتی کہ وہ منہ سے کیا بک رہا ہے اور اس کے اَعضاء و جوارح سے کیا افعال سرزد ہو رہے ہیں' لہٰذا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی حالت میں کسی بات یا کسی حرکت سے کیا کیا گُل کھلیں گے' کیسے کیسے جھگڑے اور فسادات جنم لیں گے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حکومتی اور ریاستی سطح کے بڑے بڑے راز شراب کے نشے میں چُرا لیے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ تمہیں ان چیزوں سے بچانا چاہتا ہے' جبکہ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے مابین عداوت اور بغض پیدا کرے۔ اسی طرح جوئے سے بھی بغض و عداوت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی جوئے میں ہار جاتا ہے' پھر پے در پے ہارتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ پھٹ پڑتا ہے اور غصّے میں آگ بگولا ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے نظر آ رہا ہے کہ میرا جو حریف مجھ سے جیت رہا ہے وہ کسی محنت کی وجہ سے نہیں جیت رہا۔ کسی نے محنت اور کوشش سے کچھ کمایا ہو تو اس سے دوسرے کو جلن محسوس نہیں ہوتی' لیکن جوئے میں بے محنت کی کمائی ہوتی ہے جسے مخالف فریق برداشت نہیں کر سکتا' اور اس طرح انسانی تعلقات میں کئی منفی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں اور عداوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

﴿وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ﴾ ''اور (شیطان یہ بھی چاہتا ہے کہ) تمہیں روکے اللہ کی یاد سے اور نماز سے۔''

اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے والا معاملہ بھی شراب کا تو بالکل واضح ہے' لیکن جوئے میں بھی یونہی ہوتا ہے کہ آدمی ایک بار اس میں لگ جائے تو پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ تاش اور شطرنج وغیرہ بھی ایسے کھیل ہیں کہ ان میں مشغول ہو کر انسان ذکر اور نماز جیسی چیزوں سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''تو اب باز آتے ہو یا نہیں؟''

یہ انداز بڑا سخت ہے اور اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ شراب اور جوئے کے بارے میں ایک واضح ہدایت قبل ازیں آ چکی تھی: ﴿فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں' اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں' البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ تو اسی وقت تمہیں سمجھ لینا چاہیے تھا اور باز آ جانا چاہیے تھا۔ اُس پہلے حکم میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت' مشیّت اور شریعت کا رخ تو واضح ہو گیا تھا۔ پھر اگلا قدم اٹھایا گیا اور حکم دیا گیا: ''جب تم لوگ شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ.....'' (النساء:۴۳)۔ اس سے تو پورے طور سے واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ دین کا اہم ترین ستون نماز ہے: ((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ))(۱) اور یہ شراب نماز سے روک رہی ہے' تو تمہیں یہ چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ بہر حال اب آخری بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گئی ہے' تو اسے سن کر کیا اب بھی باز نہیں آؤ گے؟

آیت ۹۲ ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور (ان کی نافرمانی سے) بچتے رہو۔''

﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾﴾ ''پھر اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول (ﷺ) پر تو ذمّہ داری ہے بس صاف صاف پہنچا دینے کی۔''

یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کا حکم پہنچانا رسولؐ کے ذمّے تھا' تو رسولؐ نے پہنچا کر اپنی ذمہ داری ادا کر دی' اب معاملہ اللہ کا اور تمہارا ہو گا۔ اللہ تم سے نمٹ لے گا' تم سے حساب لے لے گا۔

اب جو اگلی آیت آ رہی ہے یہ بھی قرآن مجید کے فلسفہ اور حکمت کے ضمن میں بہت بنیادی آیت ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب کے بارے میں اتنا سخت انداز آیا کہ

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان ۔ راوی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

شراب اور جوا گندے شیطانی کام ہیں' ان سے باز آتے ہو یا نہیں؟ تو بہت سے مسلمانوں کو تشویش لاحق ہوگئی کہ ہم جو اتنا عرصہ شراب پیتے رہے تو یہ گندگی تو ہماری ہڈیوں میں بیٹھ گئی ہوگی۔ آج سائنس کی زبان میں جیسے کوئی شخص کہے کہ میرے جسم کا تو کوئی ایک خلیہ(cell) بھی ایسا نہیں ہوگا جس میں شراب کے اثرات نہ پہنچے ہوں۔ تو اب ہم کیسے پاک ہوں گے؟ اب کس طریقے سے یہ گندگی ہمارے جسموں سے دُھلے گی؟ ان کی یہ تشویش بجا تھی۔ جیسے تحویلِ قبلہ کے وقت تشویش پیدا ہوگئی تھی کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا اور ہم بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے تو وہ نمازیں تو ضائع ہوگئیں' اور نماز ہی تو ایمان ہے۔ تو اس پر مؤمنین کی تسلی کے لیے فرمایا گیا تھا:﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ''اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے''۔ ایسے ہی یہاں ان کی دل جوئی کے لیے فرمایا:

آیت ۹۳ ﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾
''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے''

کسی شے کی حرمت کے قطعی حکم آنے سے پہلے جو کچھ کھایا پیا گیا' اس کا کوئی گناہ ان پر نہیں رہے گا۔ یہ کوئی ہڈیوں میں بیٹھ جانے والی شے نہیں ہے' یہ تو شرعی اور اخلاقی قانون (Moral Law) کا معاملہ ہے' طبعی قانون(Physical Law) کا نہیں ہے۔ طبعی(Physical) طور پر تو کچھ چیزوں کے اثرات واقعی دائمی ہو جاتے ہیں' لیکن Moral Law کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ گناہ تو اُحد پہاڑ کے برابر بھی ہوں تو سچی توبہ سے بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ ازروئے حدیث نبویؐ: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ))(۱) ''گناہ سے حقیقی توبہ کرنے والا بالکل ایسے ہے جیسے اس نے کبھی وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا''۔ صدقِ دل سے توبہ کی جائے تو نامۂ اعمال بالکل دھل جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی کسی تشویش کو بالکل اپنے قریب مت آنے دو۔

﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں' پھر

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیھقی ۱۵۴/۱۰۔ فتح الباری لابن حجر ۴۸۰/۱۳۔ راوی: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں ۔ اور اللہ تعالیٰ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہ دراصل تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ 'اسلام' ہے۔یعنی اللہ کو مان لیا' رسولؐ کو مان لیا اور اس کے احکام پر چل پڑے۔اس سے اوپر کا درجہ 'ایمان' ہے'یعنی دِل کا کامل یقین' جو ایمان کے دل میں اُتر جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) کے مصداق ایمان قلب میں اُتر جائے گا تو اعمال کی کیفیت بدل جائے گی' اعمال میں ایک نئی شان پیدا ہو جائے گی' زندگی کے اندر ایک نیا رنگ آ جائے گا جو کہ خالص اللہ کا رنگ ہوگا۔ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ﴾ (البقرۃ:۱۳۸) اور اس سے بھی آگے جب ایمان ''عین الیقین'' کا درجہ حاصل کر لے تو یہی درجۂ احسان ہے۔حدیثِ نبویؐ میں اس کی کیفیت یہ بیان ہوئی ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۱) ''یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے' اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو پھر (یہ کیفیت تو پیدا ہونی چاہیے کہ) وہ تو تجھے دیکھتا ہے''۔یعنی تم اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے لیے جہاد کرو' اس کی راہ میں بھاگ دوڑ کرو' اور اس میں تقویٰ کی کیفیت ایسی ہو جائے کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

احسان کی یہ تعریف ''حدیثِ جبرائیل'' میں موجود ہے۔اس حدیث کو اُمُّ السُّنَّة کہا گیا ہے' جیسے سورۃ الفاتحہ کو اُمّ القرآن کا نام دیا گیا ہے۔جس طرح سورۃ الفاتحہ اساس القرآن ہے' اسی طرح حدیثِ جبرائیلؑ سنت کی اساس ہے۔اس حدیث میں ہمیں یہ تفصیل ملتی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آئے۔صحابہ رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا' وہاں انہوں نے کچھ سوالات کیے۔حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہلا سوال اسلام کے بارے میں کیا: يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ! اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر تمہیں اس کے لیے سفر کی

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان..... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان' ح۹و۱۰۔ ودیگر کتب احادیث۔

استطاعت ہو''۔یعنی اسلام کے ضمن میں اعمال کا ذکر آ گیا۔ پھر جبرائیلؑ نے کہا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتلایئے! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر' یومِ آخرت پر اور تقدیر کی اچھائی اور برائی پر''۔اب یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ ایمان تو اسلام میں بھی موجود ہے' یعنی زبانی اور قانونی ایمان' لیکن دوسرے درجے میں ایمان کو اسلام سے علیحدہ کیا گیا ہے اور اعمالِ صالحہ کا تعلق ایمان کے بجائے اسلام سے بتایا گیا ہے۔اس لیے کہ جب ایمان دل میں اُتر کر یقین کی صورت اختیار کر جائے تو پھر اعمال کا ذکر الگ سے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ایمان کے اس مرحلے پر اعمال لازماً درست ہو جائیں گے۔پھر ایمان جب دل میں مزید گہرا اور پختہ ہوتا ہے تو اعمال بھی مزید درست ہوں گے۔یوں سمجھئے کہ جتنا جتنا درخت اوپر جا رہا ہے اسی نسبت سے جڑ نیچے گہرائی میں اتر رہی ہے۔ ایمان کی جڑ نے دل کی زمین میں قرار پکڑا تو اسلام سے ایمان بن گیا۔ جب یہ جڑ مزید گہری ہوئی تو تیسری منزل یعنی احسان تک رسائی ہو گئی اور یہاں اعمال میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ چنانچہ جب حضرت جبرائیلؑ نے احسان کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو.....'' آپؐ کا جواب تین روایتوں میں تین مختلف الفاظ میں نقل ہوا ہے: (۱) اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ..... (۲) اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى كَاَنَّكَ تَرَاهُ .....[1] (۳) اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ[2]۔اگلے الفاظ: ((فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) تینوں روایتوں میں یکساں ہیں۔یعنی ایک بندۂ مؤمن اللہ کی بندگی' اللہ کی پرستش' اللہ کے لیے بھاگ دوڑ' اللہ کے لیے عمل' اللہ کے لیے جہاد ایسی کیفیت سے سرشار ہو کر کر رہا ہو گویا وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ رہا ہے۔تو جب اللہ سامنے ہو گا' تو پھر کیسے کچھ ہمارے جذباتِ عبدیت ہوں گے' کیسی کیسی ہماری قلبی کیفیات ہوں گی۔اس دنیا میں بھی یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے' لیکن یہ کیفیت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو احسان کا ایک اس سے نچلا درجہ بھی ہے۔یعنی کم از کم یہ بات ہر وقت مستحضر رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔تو یہ ہیں وہ تین درجے جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔

''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' مولانا مودودی مرحوم کی ایک قابل قدر کتاب

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان' ح ۱۱۔ومسند احمد' ح ۲۷۷۵۔

(۲) مسند احمد' ح ۱۷۹۔

ہے۔ اس میں مولانا نے اسلامؑ ایمانؑ احسان اور تقویٰ چار مراتب بیان کیے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تقویٰ علیحدہ سے کوئی مرتبہ ومقام نہیں ہے۔ تقویٰ وہ روح (spirit) اور وہ قوتِ محرکہ (driving force) ہے جو انسان کو نیکی کی طرف دھکیلتی اور اُبھارتی ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ نظر میں تقویٰ کی تکرار کا مفہوم یوں ہے کہ تقویٰ نے آپ کو baseline سے اوپر اٹھایا اور اب آپ کے ایمان اور عمل صالح میں اور رنگ پیدا ہو گیا ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾۔ پھر تقویٰ میں مزید اضافہ ہوا اور تقویٰ نے آپ کو مزید اوپر اٹھایا تو اب وہ یقین والا ایمان پیدا ہو گیا ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾۔ اب یہاں عمل صالح کے علیحدہ ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ جب دل میں ایمان اُتر گیا تو اعمال خود بخود درست ہو گئے۔ پھر تقویٰ اگر مزید رو بہ ترقی ہے ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا﴾ تو اس کے نتیجے میں ﴿وَّاَحْسَنُوْا﴾ کا درجہ آ جائے گا' یعنی انسان درجۂ احسان پر فائز ہو جائے گا۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ آمین!)

ایمان اور تقویٰ سے اعمال کی درستی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان پیشِ نظر رہنا چاہیے:

((اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً ' اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ' وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ' اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ)) (۱)

''آگاہ رہو' یقیناً جسم کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے' جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''اور اللہ ایسے محسن بندوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

اللہ کے جو بندے درجۂ احسان تک پہنچ جاتے ہیں وہ اس کے محبوب بن جاتے ہیں۔

اس سورۂ مبارکہ (آیت ۷۱) میں پہلے ایک غلط راستے کی نشاندہی کی گئی تھی: ﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا..... ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا.....﴾ یہ گمراہی وضلالت کے مختلف مراحل کا ذکر ہے کہ وہ اندھے اور بہرے ہو گئے' اللہ نے پھر ڈھیل دی تو اس پر وہ اور بھی اندھے اور بہرے ہو گئے' اللہ نے مزید ڈھیل دی تو وہ اور زیادہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اُس راستے پر انسان قدم بہ قدم گمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ مگر ایک راستہ یہ ہے' ہدایت کا راستہ' اسلامؑ ایمانؑ احسانؑ اور تقویٰ کا راستہ۔ یہاں انسان کو درجہ بہ درجہ ترقی ملتی چلی جاتی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

درس ٦

اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف

انجینئر نوید احمد

(گزشتہ سے پیوستہ)

سورۃ الفتح، آیت ۲۹

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' ..... ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ ''اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں'' ..... ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ ''کفار کے مقابلے میں بڑے سخت ہیں'' ..... ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ''آپس میں انتہائی نرم ہیں'' ..... ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ''تم اُنہیں دیکھتے ہو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے وہ اللہ کا فضل اور اُس کی رضا چاہتے ہیں'' ..... ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ''اُن کی نشانی ہے اُن کے چہروں میں سجدوں کے اثرات'' ..... ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ﴾ ''یہ اُن کی مثال ہے تورات میں'' ..... ﴿وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ''اور انجیل میں اُن کی مثال ہے..... ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ﴾ ''اُس کھیتی کے مانند جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے'' ..... ﴿فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ ''پھر اُس کی کمر کو مضبوط کرتی ہے پھر ذرا موٹی ہوتی ہے، پھر کھڑی ہو جاتی ہے اپنی نال پر'' ..... ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ ''کاشت کار کو وہ بڑی بھلی لگتی ہے'' ..... ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ''تاکہ دل جلیں اُن سے کُفّار کے'' ..... ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے'' ..... ﴿مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ ''مغفرت اور شاندار بدلے کا۔''

اِس آیت میں اقامتِ دین کے لیے جدّوجہد کرنے والوں کے تین اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ دین کے دشمنوں سے نفرت' دین کے خادموں سے محبت اور اللہ سے والہانہ لگاؤ۔

دین کے دشمنوں سے نفرت:

• اللہ کے رسول ﷺ اور اُن کے ساتھی اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے ایک کامل عملی نمونہ ہیں۔ اُن کی محبت اور دشمنی کا معیار صرف اور صرف دین تھا۔ جو شخص دین کی سربلندی کے لیے مال وجان لگا رہا ہے وہ اُنہیں انتہائی محبوب تھا خواہ اُس کا تعلق کسی بھی رنگ' نسل یا علاقے سے ہو۔ جو دین کا دشمن تھا اُس سے اُنہیں انتہائی نفرت تھی خواہ وہ اُن کا نسلی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔

• دین کے دشمنوں سے نفرت یعنی ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافروں کے ساتھ سختی اور تُند خوئی سے پیش آتے تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی' اصول کی مضبوطی' سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے تھے۔ وہ موم کی ناک نہیں تھے کہ اِنہیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ نرم چارہ نہیں تھے کہ کافر اُنہیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں۔ اُنہیں کسی خوف سے دبایا نہیں جاسکتا تھا۔ اُنہیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ کافروں کے پاس ایسی طاقت یا تدبیر نہیں تھی کہ اُنہیں اُس مقصدِ عظیم سے ہٹا دیں جس کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھے تھے۔

• ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ کا مظاہرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اِس طرح بھی کیا کہ غزوات کے دوران حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر' حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام' حضرت علی بن ابی طالب' حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہم نے اپنے اقارب عتبہ' شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا۔ غزوۂ بدر کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہا تھا: ''اگر تم میری تلوار کی زد میں آجاتے تو کبھی نہ چھوڑتا''۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جو مخلص مسلمان تھے' ایک موقع پر عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ حکم دیں تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر کردوں' لیکن آپ ﷺ نے منع فرمادیا۔

دین کے خادموں سے محبت:

• اقامتِ دین کی جدّوجہد کرنے والوں کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی: ﴿رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ﴾ یعنی دین کے خادموں سے محبت۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اِس صفت کو اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ ؕ﴾ (الحشر: ۹)

''وہ (انصاری صحابہؓ) اُن (مہاجر صحابہؓ) کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ خود ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔''

• ویسے تو سورۃ الحجرات آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ﴾ یعنی تمام مؤمن باہم بھائی بھائی ہیں' لیکن اقامتِ دین کی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہو کر یہ رشتہ صرف اخوت ہی نہیں بلکہ رفاقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِس جدوجہد میں شریک ساتھیوں کے لیے رفیق کی اصطلاح انتہائی مناسب ہے۔ رفیق کا لفظ رفق سے بنا ہے جس کے معنی نرمی کے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَن یُّحرَمُ الرِّفقَ یُحرَمُ الخَیرَ)) (۱)

''جو کوئی دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا۔''

گویا رفیق کا لفظ ہی باہم محبت اور ہمدردی کرنے کا مظہر ہے۔

• مندرجہ ذیل احادیثِ قدسیہ میں اُن لوگوں کے لیے جو صرف اللہ ہی کی خاطر باہم محبت کرتے ہیں' بڑی عظیم خوشخبریاں بیان ہوئی ہیں:

وَجَبَتۡ مَحَبَّتِیۡ لِلۡمُتَحَابِّیۡنَ فِیَّ وَالۡمُتَجَالِسِیۡنَ فِیَّ وَالۡمُتَزَاوِرِیۡنَ فِیَّ وَالۡمُتَبَاذِلِیۡنَ فِیَّ (۲)

''واجب ہو گئی میری محبت اُن کے لیے جو میری وجہ سے باہم محبت کرتے ہیں' میری وجہ سے باہم مل کر بیٹھتے ہیں' میری وجہ سے ایک دوسرے کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔''

اِنَّ اللّٰهَ یَقُوۡلُ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ اَیۡنَ الۡمُتَحَابُّوۡنَ بِجَلَالِیۡ اَلۡیَوۡمَ اُظِلُّهُمۡ فِیۡ ظِلِّیۡ یَوۡمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیۡ (۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرمائے گا: کہاں ہیں وہ جو میرے جلال کی خاطر باہم محبت کرتے تھے؟ آج میں اُنہیں اپنے سایہ میں مقام دوں گا جبکہ اِس دن میرے

سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''

• نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد میں باہم محبت کرنے کی ترغیب اِن الفاظ میں بیان ہوئی:

((لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ)) (٤)

''تم جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک ایمان پر قائم نہ رہو اور ایمان پر قائم نہیں رہ سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں وہ عمل بتاؤں کہ جسے اختیار کر کے تم باہم محبت پیدا کر سکتے ہو؟ ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کیا کرو۔''

• مذکورہ بالا دو صفات کے حاملین کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے بشارت دی:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ))(٥)

''جس نے محبت کی اللہ کے لیے اور دشمنی کی اللہ کے لیے اور دیا اللہ کے لیے اور روکا اللہ کے لیے تو اُس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔''

اقبال نے اِن دو صفات کو یوں بیان کیا :۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

اللہ سے والہانہ لگاؤ:

• بندوں سے تعلق کے بعد اب اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق کی کیفیت بیان ہوئی: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ''تم جب دیکھو گے اُنہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔ یعنی اُن کی تمام محنتوں اور سرگرمیوں کا مقصدِ وحید صرف اور صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ نقشہ بالفعل تھا جسے ہر دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا۔ آئندہ بھی کبھی اقامتِ دین کی جدّوجہد کامیاب نہیں ہوگی جب تک کہ اِس کا ایک عکس اُن لوگوں کے اندر موجود نہ ہو جو اِس کام کا بیڑا اٹھانے کا عزم کریں۔

• یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت کے بغیر اقامت دین کی منزل سر نہیں کی جا سکتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ

يَنْصُرْكُمُ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴿۱۶۰﴾﴾ (آلِ عمران)

''اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا' اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد؟ اور چاہیے کہ مؤمن اللہ ہی پر توکّل کریں۔''

ماضی میں وہی باہمت افراد اقامتِ دین کی جدّوجہد میں سرخرو ہوئے جن کا اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق تھا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۱۴۸﴾﴾ (آلِ عمران)

''اور کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں کہ اُن کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے کئی اللہ والوں نے' پھر نہ تو اُنہوں نے بزدلی دکھائی اُس پر جو کچھ بھی مصیبتیں اُن پر آئیں اللہ کی راہ میں' نہ ہی وہ کمزور پڑے اور نہ ہی وہ باطل کے سامنے دبے' اور اللہ ایسے صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور اُن کی پکار نہیں تھی مگر یہ کہ اُنہوں نے یہی دعا کی کہ اے رب ہمارے' تو بخش دے ہمارے گناہ اور جو بھی ہم نے اپنے معاملات کے اندر زیادتی کی اور تو جما دے ہمارے قدموں کو اور تو ہماری مدد فرما کافر قوم کے مقابلے میں۔ تو اللہ نے اُنہیں دنیا کا بدلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کا بدلہ تو کیا خوب عمدہ ہے۔ اور اللہ ایسے نیکوکاروں کو پسند فرماتا ہے۔''

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ.....﴾ (البقرۃ: ۲۵۱)

''تو جب طالوت اپنے لشکروں کو لے کر نکلے اُنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں ایک نہر کے ذریعے۔ جس کسی نے پی لیا اِس نہر سے سیر ہو کر تو اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں' اور جس نے اُس نہر میں سے نہیں چکھا سوائے اِس کے کہ جو ایک چلو بھر پانی پی لے اپنے ہاتھ سے' پس بے شک وہ میرے ساتھ چلے گا۔ تو اُنہوں نے اُس میں سے سیر ہو کر پیا سوائے اُن میں سے چند ایک کے۔ پھر جب اُس نہر کو عبور کیا طالوت اور اُس کے مؤمن ساتھیوں نے تو اُنہوں نے کہا کہ آج تو ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے جالوت اور اُس کے لشکروں کے مقابلے میں۔ ایسے میں کہا اُن لوگوں نے جو یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں ''کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے' اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ پھر جب وہ آمنے سامنے آ گئے جالوت اور اُس کے لشکروں کے' اُنہوں نے دعا کی ''اے ہمارے رب ہم پر انڈیل دے صبر اور ہمارے قدموں کو جما دے اور ہماری مدد فرما اِس کافر قوم کے مقابلے میں''۔ تو اُنہوں نے شکست سے دوچار کر دیا اُن کافروں کو اللہ کے حکم سے.....''

مستقبل میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اقامتِ دین کے وعدے کو پورا فرمائے گا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵﴾ (النور)

''وعدہ کیا اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے کہ وہ اُنہیں لازماً خلافت عطا کرے گا زمین میں جیسے کہ اُس نے خلافت دی تھی اُن لوگوں کو جو اُن سے پہلے گزرے ہیں' اور وہ لازماً غلبہ عطا کرے گا اُن کے اُس دین کو جو اُس نے اُن کے لیے پسند کر لیا اور وہ لازماً بدل دے گا اُن کے لیے خوف کی حالت کو امن میں۔ اب وہ میری ہی عبادت کریں گے' میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ جو کوئی بھی ایسے پختہ وعدوں کے بعد ناشکری کرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

لہٰذا اگر ہم اقامتِ دین کی جدوجہد کے حوالے سے مخلص ہیں تو لازم ہے کہ ہم اللہ سے محبت کریں' اُس کی ناراضگی سے بچیں' اُس سے لو لگائیں اور اُس کے حضور مدد کے لیے خصوصی دعائیں کریں۔

• یہ حقیقت ہے کہ ہر کام کا ایک محرک ہوتا ہے۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کا واحد محرک اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کی طلب ہونا چاہیے۔ اللہ کے فضل کے الفاظ قرآنِ حکیم میں دنیا کی مادی اور روحانی دونوں طرح کی نعمتوں کے لیے آئے ہیں اور آخرت کے انعامات کے لیے بھی وارد ہوئے ہیں۔ بلاشبہ ہم ان سب ہی کے محتاج ہیں لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کو اپنے مقصود میں مادی کے بجائے روحانی نعمتوں اور اُخروی انعامات کو مقدم کرنا ہوگا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾﴾ (الحدید)

''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے' جو تیار کی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

• اللہ کی رضا کا معاملہ فضل سے بھی بڑھ کر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾﴾ (التوبۃ)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے اُن باغات کا جن کے نیچے سے ندیاں بہتی ہوں گی۔ وہ ان باغات میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ گھروں کا ہمیشہ رہنے والے باغات میں۔ اور سب سے بڑھ کر ہے اللہ کی رضا' اور وہی ہے شاندار کامیابی۔''

گویا اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا بلند تر مقصد اور نصب العین اللہ کی رضا کا حصول ہونا چاہیے۔ نصب العین کے درجے میں اُن کے سامنے دنیا کی کوئی شے نہیں ہونی چاہیے۔ دین کا غلبہ اور اِس کے لیے جدوجہد ایک فریضہ ہے لیکن نصب العین نہیں۔ نصب العین صرف اور صرف آخرت کی فوز و فلاح اور اللہ کی رضا کے حصول کو بنانا چاہیے۔ نصب العین کے

مقام پر اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شامل کرنا اپنے فکر کے اندر کجی پیدا کرنا ہے۔ اگر مقصود اقامتِ دین ہی ہو جائے تو ممکن ہے اس کے لیے ایسی سرگرمیاں شروع کر دی جائیں جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہوں۔

• اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ بندے کا تعلق مع اللہ مضبوط ہو۔ اِس کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔ ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ (تم اُن کو دیکھتے ہو رکوع کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے۔) یعنی اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والے کثرت سے نوافل ادا کرتے ہیں۔ پھر نوافل میں سے بھی وہ سحر کے وقت نمازِ تہجد کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ یہ وقت اللہ کی رضا کے حصول کے لیے انتہائی اہم ہے کیونکہ اِس وقت اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا پر اپنی خصوصی تجلیات کا ظہور فرما کر ندا لگاتا ہے:

هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطٰى، هَلْ مِنْ دَاعٍ يُسْتَجَابُ لَهٗ، هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ يُغْفَرُ لَهٗ(۶)

''ہے کوئی دعا کرنے والا کہ میں اُس کی دعا پوری کروں؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اُس کو عطا کروں؟ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اُس کو بخش دوں؟''

• نبی اکرم ﷺ نے مدینہ آتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پہلی نصیحت یہ فرمائی تھی کہ:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ، وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ)) (۷)

''اے لوگو! کثرت سے سلام کیا کرو' اور کھانے کھلاؤ' اور اُس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں' تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے پوری سلامتی کے ساتھ۔''

• ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (علامت ہے اُن کی اُن کے چہروں پر سجدوں کے آثار سے۔) سے مراد وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع و خضوع سے ہر متقی عبادت گزار کے چہرے پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ انوار جو بندہ کی ایمان افروز باطنی کیفیات کی غمازی کر رہے ہوتے ہیں۔ محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے بندے کا چہرہ ہے۔ مثال کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چہروں کی کیفیت تو یہ تھی کہ دیکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ یہ خیر الخلائق ہیں۔ اللہ سے محبت کا نور اُن کے چہروں پر چمک رہا ہوتا تھا۔ یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی

کہتے تھے کہ مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے' یہ تو اُسی شان کے لوگ نظر آتے ہیں۔

• ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذکورہ بالا صفات کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ تحریفوں کے باوجود تورات کتاب استثناء' باب ۳۳' آیات ۲ تا ۳' میں یہ الفاظ موجود ہیں:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر آشکار ہوا۔ وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا' دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت اُن کے لیے تھی۔ وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے' اُس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں تیری بات مانیں گے۔''

(بحوالہ معارف القرآن' جلد ہشتم' ص ۹۴)

فتح مکہ کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد دس ہزار تھی' جو فاران سے طلوع ہونے والے اُس نورانی پیکر کے ساتھ شہرِ خلیل میں داخل ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی کے لفظ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مضمون سمجھا جاتا ہے۔ عبارت کے آخری الفاظ اللہ کے ساتھ خصوصی تعلق کو ظاہر کر رہے ہیں۔

• ﴿مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ انجیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال کھیتی سے دی گئی ہے۔ انجیل متی' باب ۱۳' آیت ۳۱ میں یہ الفاظ موجود ہیں:

''اُس نے ایک اور تمثیل اُن کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اُس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اُس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔'' (آیات ۳۱۔۳۲)

ایک مشہور واقعہ اِس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا ذکر سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی بڑی صراحت سے کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب مسلمان افواج بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں تو یہ محاصرہ بہت طول پکڑ گیا۔ بیت المقدس میں محصور عیسائی مذہبی رہنماؤں نے کہا کہ ایک درویش بادشاہ کی علامات ہماری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہوگا۔ علامات جب بیان کی گئیں تو اُن کا کامل مصداق حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اِسی لیے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لائے تو وہاں کے

لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی شہر کے دروازے کھول دیے اور کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی علامات ہماری کتابوں میں درج ہیں۔

• آیت زیر درس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے انتہائی مناسبِ حال مثال اُس کھیتی سے دی گئی ہے جو ابتدا میں انتہائی نازک اور کمزور تھی لیکن رفتہ رفتہ مضبوط ہو کر اپنے زور پر پوری قوت سے کھڑی ہوگئی۔ اِس کھیتی کو لگانے والے باغبان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اِس کھیتی کی آبیاری کی ہے۔ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (جو بھلی لگتی ہے باغبان کو) یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مبارک اِس لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہا ہے اور جن کی تمنا ہے:

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں!

• ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (تا کہ اِن کے ذریعے سے کافروں کا دل جلائے) سے مراد وہ کفّار اور منافقین ہیں جنہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شدید بغض وعداوت ہے اور وہ ان کی کامیابیوں پر اپنے دل میں جلن اور گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جنہوں نے قدم قدم پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخالفت کی اور اُن کا راستہ روکنے کی ہر تدبیر اختیار کر لی' اِس کھیتی کو ہرا بھرا دیکھ کر اُن کا دل تو جلے گا۔ صحابہ کرامؓ سے محبت دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا مظہر ہے اور اُن سے عداوت درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کا ثبوت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِیْ' فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ' وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ ' وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِیْ' وَمَنْ آذَانِیْ فَقَدْ آذَی اللّٰهَ' وَمَنْ آذَی اللّٰهَ یُوْشِكُ اَنْ یَّاْخُذَهٗ (۸)

''میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو! میرے بعد کہیں اُن کو ہدفِ ملامت نہ بنا دینا۔ آگاہ ہو جاؤ' جو بھی اُن سے محبت کرے گا وہ درحقیقت میری محبت کی بنا پر اُن سے محبت کرے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا تو وہ مجھ سے بغض کی وجہ سے ایسا کرے گا۔ جو اُنہیں دکھ دے گا وہ مجھے دکھ دے گا' اور جو مجھے دکھ دے گا وہ دراصل اللہ کو ناراض کرے گا۔ جس نے اللہ کو ناراض کیا تو پھر امکان ہے کہ اللہ اُس کی پکڑ کرے گا۔''

• آیت کے آخری حصہ میں فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے' مغفرت اور بہت بڑے اجر کا''۔ یہاں مِنْ بیانیہ ہے۔ اللہ کا یہ

وعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت سے ہے۔ وہ چونکہ واقعتاً ایمان لائے تھے اور اچھے اعمال بھی کر رہے تھے لہٰذا دنیا میں تو فتح و کامرانی اُن کے قدم چوم ہی رہی ہے' آخرت کے اعتبار سے بھی وہ کامیاب و کامران ہیں۔ وہاں اُن کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کی خوشخبریاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت سے معمور فرمائے اور ہماری ہدایت میں اضافہ فرمائے۔ آمین!

سورۃ المائدۃ' آیت ۵۴

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!''..... ﴿مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ﴾ ''جو کوئی بھی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا''..... ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ﴾ ''تو عنقریب اللہ کچھ ایسے لوگ لے آئے گا''..... ﴿یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ﴾ ''جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اُس سے محبت کریں گے''..... ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ ''مؤمنوں کے حق میں نرم ہوں گے اور کافروں پر سخت ہوں گے''..... ﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے''..... ﴿وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ''اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''..... ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ ''یہ اللہ کی عنایت ہے' وہ جس پر چاہتا ہے اپنی عنایت فرماتا ہے''..... ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔''

ارتداد کا مفہوم:

• اِس آیت میں اہل ایمان کو ارتداد یعنی دین سے پھر جانے کے اندیشے سے خبردار کر کے چونکایا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ﴾ ''جو کوئی پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے''۔ ارتداد کے معنی ہیں لوٹ جانا' پھر جانا' پسپائی اختیار کرنا۔ ایمان سے پسپائی ایک ظاہری ہے اور ایک باطنی۔

• ظاہری پسپائی یا علی الاعلان پسپائی کو ہم عرف عام میں یا اصطلاح میں ارتداد کہتے ہیں۔ ایک شخص کھلم کھلا اسلام سے انحراف کا اعلان کر کے کوئی اور مذہب اختیار کر لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گیا۔ مثلاً حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے جس مسلمان شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں وہ وہاں جا کر عیسائی ہو گیا تھا۔ یہ بالکل ابتداءِ اسلام میں ارتداد کا واقعہ ہے۔ پھر جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا آخری دَور ہے اِس میں ارتداد شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ نبوت کے کئی

جھوٹے دعوے دار کھڑے ہو گئے اور بہت سے لوگ اُن کی تصدیق کر کے مرتد ہو گئے۔ یہ ہے ظاہری ارتداد یعنی اسلام سے علی الاعلان، کھلم کھلا انحراف، کسی اور نبوت کا اقرار یا کسی اور مذہب کو قبول کر لینا۔ اسلام میں اِس قسم کے مرتد کی سزا قتل ہے۔

• باطنی ارتداد یہ ہے کہ آدمی اندر ہی اندر مرتد ہو گیا ہو۔ گویا انڈے کے اندر جو کچھ تھا چوزہ تو بن چکا ہے مگر ابھی خول ٹوٹا نہیں ہے۔ قانون کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ جب تک وہ خول نہیں ٹوٹتا اُس وقت تک وہ مسلمان شمار ہو گا۔ اندر سے انسان کافر ہو چکا ہو اور قانونی اعتبار سے ظاہراً مسلمان ہو تو یہ باطنی ارتداد ہے جس کو ہم نفاق کہتے ہیں۔ منافق حقیقت میں کافر تو ہو چکا ہے لیکن قانوناً وہ مسلمان رہتا ہے۔ سورۃ المنافقون آیت ۳ میں منافقین کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا.....﴾ ''یہ اِس لیے ہوا کہ وہ ایمان لائے تھے، پھر اُنہوں نے کفر کیا.....'' لیکن یہ کفر کون سا تھا؟ یہ اعلانیہ کفر نہیں تھا، بلکہ اندر ہی اندر کا کفر تھا۔

• سورۃ المائدۃ کی اِس آیت میں لفظ ''ارتداد'' باطنی پسپائی یعنی نفاق کے مفہوم میں آیا ہے۔ اللہ کو اپنے بندوں میں کچھ اوصاف مطلوب ہیں۔ اگر وہ اوصاف ہم میں موجود ہیں تو ہم مؤمن ہیں ورنہ ہم ایمان سے پسپائی اختیار کر چکے ہیں، گویا باطنی اعتبار سے مرتد ہو چکے ہیں۔ اب اللہ ہمیں کسی اور قوم سے نیست و نابود کرائے گا اور اُسے ایمان کی دولت اور مطلوبہ اوصاف سے سرفراز فرمائے گا۔ یہ حقیقت سورۂ محمد ﷺ کی آخری آیت میں یوں بیان ہوئی:

﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾ ﴾

''اور اگر تم نے پیٹھ دکھائی تو وہ بدل کر لے آئے گا تمہارے سوا کسی اور قوم کو اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔''

مسلمانوں کی تاریخ میں اِس کی مثال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تاتاریوں کے ہاتھوں عربوں کو بدترین تباہی سے دوچار کیا اور پھر تاتاریوں کے ایک قبیلہ ترکانِ عثمانی کے ہاتھ میں خلافت کا جھنڈا تھما دیا، بقول اقبال ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

• آیت کے اِس حصہ میں چونکا دینے کا اسلوب اِس اعتبار سے ہے کہ خبردار کیا جا رہا ہے کہ جو بھی تم میں سے دین سے پھر جائے گا وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اللہ کا کچھ بگاڑ لے گا۔ اگر تمہیں

آج دین کی خدمت کا موقع ملا ہے تو یہ سعادت حاصل کر کے تم اللہ پر احسان نہیں کر رہے بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تمہیں اِس خدمت کا موقع دیا ہے۔

منّت منِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

''تم اپنا احسان نہ دھرو کہ تم بادشاہ کی خدمت کر رہے ہو' بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اُس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔''

اقامتِ دین کی جدوجہد ایک سعادت تھی جس کے لیے اللہ نے تمہیں چُن لیا ہے۔ اب اگر تم اِس سے دستبردار ہو رہے ہو' پسپائی اختیار کر رہے ہو' کم ہمتی کا اظہار کر رہے ہو تو اِس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا' اللہ تمہیں محروم کر کے کسی اور قوم کو اقامتِ دین کے مشن کے لیے کھڑا کر دے گا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اِس محرومی سے محفوظ فرمائے اور وہ اوصاف عطا فرمائے جو اُسے دین کے خادموں کے لیے مطلوب ہیں۔

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے مطلوبہ اوصاف:

اِس آیت میں اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ اللہ سے محبت' دین کے خادموں سے محبت' دین کے دشمنوں سے نفرت' اللہ کی راہ میں جہاد اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کو خاطر میں نہ لانا۔

اللہ سے محبت:

• ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہوگا''۔ یہ ہے اللہ اور بندے کے مابین باہمی محبت کا ایک رشتہ۔ اللہ اور بندے کے مابین جو بھی نسبت و تعلق ہے وہ دوطرفہ ہے۔ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ بھی بندے سے محبت کرتا ہے۔ بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ بھی بندے کو یاد کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۲ میں ارشاد ہوا: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ ایک حدیثِ قدسی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِیْ ' فَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِیْ مَلَاٍ خَیْرٍ مِنْهُمْ ' وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَاِنْ

اَتَانِیْ یَمْشِی اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً (۹)

''میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جو میرے متعلق وہ رکھتا ہے اور میں اُس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرے —— اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اُسے زیادہ بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں ایک گز اُس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک گز قریب ہوتا ہے تو میں اُس سے دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔''

اِسی طرح سورۂ محمد ﷺ آیت ۷ میں بشارت دی گئی: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ سورۃ الحج آیت ۴۰ میں اور تاکیدی اسلوب میں آگاہ کیا گیا: ﴿وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ﴾ ''اور اللہ لازماً مدد کرے گا اُس کی جو اللہ کی مدد کرے گا''۔ یعنی جو اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے تو اللہ بھی اُس کی مدد فرماتا ہے۔ اِس اعتبار سے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے کہ جہاں اُن کا مطلوبہ وصف ہے کہ وہ اللہ سے محبت کریں وہیں اُن کے لیے انعام ہے کہ اللہ بھی اُن سے محبت فرمائے گا۔

• یہ اسلوب کہ اللہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں' ایک لطیف نکتہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پہلے اللہ کی محبت کا ذکر اِس بشارت کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ اصل میں اللہ کا انتخاب (selection) ہے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں وارد شدہ الفاظ ﴿ھُوَ اجْتَبٰکُمْ﴾ ''اُس نے تمہیں چن لیا ہے'' کے مطابق پہلے اللہ اپنے کسی بندے کو چنتا ہے اور اُس کا چناؤ ہی اُس بندے کے لیے کل خیر کی توفیق کا سبب بنتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۴۳ میں اہل جنت کا ترانۂ حمد اِس طرح بیان ہوا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا ۫ وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ۚ﴾ ''کل شکر اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اِس کی ہدایت دی اور ہم ہرگز ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا''۔ گویا اللہ نے ہمیں چنا ہے۔ اب اِس میں جو سرور اور کیف ہے یہ سرور دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو آسان کر دے گا۔ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی ظاہری نعمت میں وہ کیف اور سرور نہیں ہوگا جو اس تأثر میں ہے کہ اللہ نے مجھے پسند فرمایا' اللہ کی نظرِ عنایت مجھ پر ہے' میں اللہ کی نگاہِ التفات میں ہوں۔ مجھے خیر کی توفیق ملی ہے تو زہے نصیب کہ ع ''قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!'' اب اِس کیف کو اپنے اوپر

طاری کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ چیز انسان کے لیے استقامت کی کتنی بڑی بنیاد بنے گی۔ وہ جو اقبال کہتا ہے کہ ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!'' اِسی طرح بندہ اپنی اِس حیثیت کا شعور وادراک کرے کہ میرے ربّ کا بلاوا میرے نام آیا ہے' مجھ تک یہ بات پہنچی ہے تو خود تو نہیں پہنچی' کسی کے پہنچائے پہنچی ہے' میرے دل میں نیکی کا یہ ارادہ پیدا ہوا تو از خود نہیں ہوا' اُسی کے پیدا کیے پیدا ہوا ہے۔ یہ درحقیقت محسوس کرنے کی شے ہے' اِسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اب بندہ بھی اللہ سے محبت کرے گا اور یہ کیفیت سامنے آئے گی کہ ﴿یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔''

• اقامتِ دین کی جدّوجہد میں اصل نصب العین اور اصل جذبۂ محرکہ اللہ کی محبت ہی ہونا چاہیے۔ اِس سے جدّوجہد میں استقامت نصیب ہوگی۔ اگر نصب العین کوئی دنیوی تبدیلی لے آنا یا کوئی انقلاب برپا کر دینا ہوگا تو مایوس کن نتائج انسان کو استقامت سے محروم کر دیں گے۔ ''محبتِ خداوندی'' ہی وہ جذبۂ محرّکہ ہے جس کے تحت انسان نتائج سے بے نیاز ہو کر استقامت' پورے ذوق وشوق اور ولولہ کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے سرگرم رہتا ہے۔

دین کے خادموں سے محبت:

• اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کی دوسری صفت یہاں بیان ہوئی: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''مؤمنوں پر بہت نرم''۔ ''اَذِلَّةٍ'' جمع ہے ذلیل کی۔ ذلیل کا لفظ اردو زبان میں گھٹیا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں اِس کا مفہوم ہے کمزور ہونا۔ سورۂ آلِ عمران آیت ۱۲۳ میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾

''اور اللہ تمہاری مدد فرما چکا ہے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے۔''

گویا ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا مفہوم ہوا ''ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم'' یعنی اپنے ہم مقصد ساتھیوں کے لیے نہایت نرم خو۔ اُن کے لیے اہم ترین افراد اپنے ہم مقصد ساتھی ہیں خواہ اُن کا تعلق کسی رنگ' نسل اور کسی علاقہ سے کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے اِن ساتھیوں کی خواہشات کا احترام کرنے والے ہوتے ہیں اور ان کی خاطر اپنی خواہشات کا ایثار کرتے ہیں۔

• یہی وصف سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں ہم نے اِن الفاظ میں پڑھا: ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ یعنی باہم رحمت وشفقت کرنے والے۔ وہاں اِس وصف کی تفصیلی وضاحت پیش کی جا چکی ہے۔

دین کے دشمنوں سے نفرت:

• اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کی تیسری صفت یہاں بیان ہوئی: ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''کافروں پر بہت سخت''۔ ''اَعِزَّةٍ'' جمع ہے عزیز کی۔ عزیز اور ذلیل ایک دوسرے کے اضداد (antonyms) ہیں۔ ذلیل کے معنی نرم اور عزیز کے معنی ہیں سخت۔ کافروں پر سخت ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ بھی اقامتِ دین کے مشن کے مخالف ہیں اُن کے مقابلہ میں آہنی چٹان ثابت ہونا۔ اُنہیں محسوس ہو کہ یہ تو بڑے سخت ہیں۔ کوئی لالچ (temptation) اُنہیں مائل نہیں کرسکتی' کوئی دھمکی اُنہیں ہراساں نہیں کرسکتی' کوئی ایذا رسانی (persecution) اُنہیں ہلا نہیں سکتی اور کوئی نصیحت اُن پر کارگر نہیں ہوسکتی۔ ایسی نصیحت کہ خواہ مخواہ تم اپنا کیریئر برباد کر رہے ہو' اپنے مستقبل کی فکر کرو' یہ تم کس راستے پر چل نکلے ہو؟ اِس طرح کی بظاہر بزرگانہ اور بڑی خیر خواہانہ انداز کی نصیحت اُن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

• اقامتِ دین کی جدوجہد کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے دین کے دشمنوں سے نفرت کی صفت انتہائی اہم ہے۔ اگر دین کے دشمنوں کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ ہوگا تو اُن کے خلاف کبھی بھی بھرپور وار نہ ہوسکے گا۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں' قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی' وہ وار کہ جو بھرپور نہیں!

• یہی وصف سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں اِن الفاظ میں بیان ہوا ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ یعنی انتہائی سخت کافروں پر۔ وہاں اِس وصف کی تفصیلی وضاحت بیان کی جا چکی ہے۔ البتہ یہ اصول سامنے آ رہا ہے کہ اہم مضامین قرآنِ مجید میں کم سے کم دو مرتبہ ملتے ہیں اور اُن میں اکثر و بیشتر ترتیب عکسی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الحج کے آخری رکوع میں شہادت علی الناس کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا ذکر پہلے اور اُمت کا بعد میں ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں اُمت کا ذکر پہلے اور نبی اکرم ﷺ کا ذکر بعد میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾۔ سورۃ الفتح میں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ پہلے اور ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ بعد میں ہے' لیکن یہاں ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ پہلے اور ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ بعد میں ہے۔

• مذکورہ بالا دوسرے اور تیسرے اوصاف کو حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریّین کو ہدایات دیتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا کہ ''سانپ کی مانند ہوشیار لیکن فاختہ کی مانند بے ضرر بنو''۔ یعنی متضاد اوصاف کو بیک وقت جمع کرو۔ سانپ بہت چوکس' چوکنا اور ہوشیار ہوتا ہے' لیکن وہ دوسرے کو ضرر بھی پہنچاتا ہے' جبکہ فاختہ بے چاری بے ضرر ہے' لیکن ساتھ ہی بہت کمزور بھی ہے' اُسے جو چاہے مار لے۔ لہٰذا فاختہ بھی نہ بنو اور سانپ بھی نہ بنو۔ ہاں سانپ کا ایک وصف تمہیں اپنے اندر لانا ہوگا یعنی ہوشیار' چوکس اور چوکنے رہو۔ کوئی تمہیں بھولا سمجھ کر تمہارے اِس بھول پن سے فائدہ نہ اٹھائے۔ البتہ تم سے کسی کو ضرر بھی نہ پہنچے۔ اِس اعتبار سے تمہیں فاختہ کا وصف اپنانا ہوگا۔ اب یہ اپنی اضداد کے اعتبار سے بہت ہی بلیغ پیرایہ ہے۔ ایک طرف نرمی ہے' ہر وقت' ہر سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار' لیکن کس کے لیے؟ اہل ایمان کے لیے' اپنے ساتھیوں کے حق میں۔ لیکن مدّمقابل یہ محسوس کرے کہ ان کے اندر تو انگلی دھنسانے کا بھی امکان نہیں ہے' کسی بھی درجے میں اِنہیں متأثر کر لینے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ تو اپنے مشن پر چٹان کی طرح قائم رہنے والے ہیں۔

اللہ کی راہ میں جہاد:

• اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کا چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں''۔ اِس وصف کے حوالے سے کافی تفصیلات درس اوّل میں سورۃ الصّف کی آیت ۱۰ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہیں۔

ملامت کرنے والوں کی ملامت کو خاطر میں نہ لانا:

• اقامتِ دین کی جدّوجہد کرنے والوں کا پانچواں وصف یہ بیان ہوا: ﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ''وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ یہ ملامت بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ملامت وہ ہوتی ہے جو ڈانٹ ڈپٹ' شرم دلانے' غلطی پر متنبّہ کرنے اور احمق قرار دینے پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی یہ انداز کہ غلط جا رہے ہو' یہ صحیح راستہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے' تمہاری مت ماری گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری ملامت ناصحانہ ہوتی ہے کہ دیکھو کچھ اپنے مستقبل کی فکر کرو' اپنے کیریئر کا دھیان کرو' تمہارے والدین نے تمہیں کن ارمانوں کے ساتھ پالا پوسا تھا' تم اُن کے دل توڑ رہے ہو۔ اُنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر تم کو پڑھایا تھا' اپنے اوپر سختیاں جھیلیں اور تمہاری ضرورتیں پوری کیں اور اب تم ان کے ارمانوں کا

خون تو نہ کرو۔ اپنا نہیں تو بال بچوں کا ہی خیال کرو۔ یہ ہے ناصحانہ انداز کی ملامت۔ یہ دو طرح کی ملامت ہے جس سے اِس راہ پر چلنے والوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔

• ناصحانہ' مشفقانہ اور خیر خواہانہ ملامت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ بسا اوقات انسان ڈانٹ ڈپٹ کے مقابلے میں تو اور سخت ہوتا چلا جاتا ہے' لیکن میٹھی چھری کے انداز میں جو کاٹ ہے اِس سے بچنا زیادہ مشکل ہے۔ فیض کی شاعری چونکہ انقلابی رنگ لیے ہوئے ہے لہٰذا وہ اِن دو طرح کی ملامتوں کا ذکر اِس طرح کرتا ہے ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

غیروں کی طرف سے ناوکِ دشنام تو آئیں گے ہی' گالیاں آئیں گی' الزامات آئیں گے' مگر اپنوں کی طرف سے بھی ہر طرح کی ملامت برداشت کرنا پڑے گی۔

• سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۲ میں ناصحانہ ملامت کی ایک مثال بیان ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ﴾

''یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔''

اِس آیت میں مشرکینِ مکہ کے بڑے بوڑھوں کی طرف سے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا ایک پُرفریب انداز بیان کیا گیا ہے۔ یہ بڑے بوڑھے بڑے ناصحانہ انداز میں بظاہر بہت خیر خواہ بن کر ایمان لانے والے نوجوانوں سے کہتے تھے کہ بالکل بے فکر ہو کر اپنے آباء و اجداد کے راستے پر چلتے رہو۔ ہمارے آباء و اَجداد حق پر تھے' ہم اُن کا راستہ کیوں ترک کریں؟ ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے' ہم نے دنیا دیکھی ہے' تم ابھی نوعمری کے دور میں ہو اور اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھتے۔ ہماری بات مانو' ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ کسی کے اپنے عزائم ہوتے ہیں جس کے لیے وہ نوجوانوں کو استعمال کرتا ہے اور اُن کی دنیا برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہتے کہ اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے آباء و اَجداد کا یہ راستہ غلط ہے اور ہماری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی تو بھی مطمئن رہو' آخرت میں

تمہاری طرف سے جواب دہی ہم کریں گے اور اگر فی الواقع ہم غلطی پر ہوئے تو بھی گھبراؤ نہیں تمہاری خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ کسی وقت انسان اگر کسی خاص کیفیت میں ہو اور اُن بزرگوں کے ساتھ اُس کے حسنِ ظن کا رشتہ برقرار ہو تو اِس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اُن سے کوئی اثر قبول کر لے۔ لہٰذا پوری شدت کے ساتھ آیت کے دوسرے حصہ میں کفار کے دعویٰ کی نفی کی گئی اور اُن کے فریب کا پردہ چاک کر دیا گیا:

﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۲﴾

''اور نہیں ہیں وہ اٹھانے والے اُن کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔''

روزِ قیامت ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا۔ قرآنِ حکیم میں یہ حقیقت پانچ بار بیان کی گئی کہ: ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام:١٤٦' بنی اسراء یل:١٥' فاطر:١٨' الزمر:٧' النجم:٣٨) ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔''

• حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مثال سے ناصحانہ ملامت کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ بڑی شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کا لباس دو سو درہم کی مالیت کا ہوتا تھا اور شام سے سل کر آتا تھا۔ وہ ایسی خوشبو سے معطر ہوتا تھا کہ جدھر سے گزرتے تھے گلیاں معطر ہو جاتی تھیں۔ گویا وہ خوش لباسی اور خوش ذوقی کی ایک علامت بن گئے تھے۔ لوگوں کی نگاہیں اُن پر اٹھتی تھیں۔ جب اُنہوں نے اسلام قبول کیا تو چچا نے یہ کہتے ہوئے گھر سے نکال دیا کہ تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے تو اُس کی جائیداد اور اُس کی چھوڑی ہوئی دولت پر بھی تمہارا کوئی حق نہیں۔ گھر سے نکلنے لگے تو چچا نے کہا کہ یہ لباس بھی اُسی باپ کی کمائی کا ہے جو تم نے پہنا ہوا ہے۔ پھر اُس نے بدن کے کپڑے بھی اتروا کر مادرزاد برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ ایسے پھٹے پرانے کمبل کے اندر ملبوس ہوتے تھے جس میں کئی پیوند لگے ہوئے ہوتے تھے۔ سوچیے! اب اُن کے دوستوں نے کس انداز میں اُنہیں ملامت کی ہوگی کہ تم نے اپنے اوپر کیا ظلم کیا ہے؟ از کجا تا بہ کجا! تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو! حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت میدانِ اُحد میں اِس حالت میں ہوئی کہ اُن کے جسم پر صرف ایک تہہ بند تھا۔ وہ تہہ بند بھی اتنا تھا کہ جب شہادت ہو گئی تو پورے جسم کو ڈھانپ نہیں سکا۔ سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاملہ پیش کیا

گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔

• سورۃ المائدۃ کی آیت زیر درس میں اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے پانچ مطلوبہ اوصاف بیان کرنے کے بعد آگاہ کیا گیا: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے''۔ گویا یہ اللہ کا فضل ہے کہ انسان کو اِقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے کی توفیق ہوئی اور اِس کے لیے مطلوبہ اوصاف میں جتنی جتنی بھی ارزانی ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے ہی سے ہوئی۔ اُسی نے چنا اگر کسی کو چنا اور اُسی نے جذبہ عطا کیا اگر کسی کو جذبہ ملا۔ یہ احساس انسان کو ایک سرور اور کیف عطا کرتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے چُنا ہے' میرے ربّ نے مجھے پسند فرمایا ہے۔ ایک طرف یہ احساس انسان کے لیے قوت و استقامت کا سب سے بڑا منبع اور سرچشمہ ہے' دوسری طرف اِس احساس سے انسان میں کبھی تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ اگر اِس کے برعکس صورت ہو کہ میں نے یہ کیا' میرے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی' تو جان لیجئے کہ یہی ''مَیں'' ہے جو اصل میں کبر اور تکبر کی شکل اختیار کرتی ہے۔

شیطان کے وار سب پر ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ جو لوگ اِس وادی میں آ گئے ہوں اور وہ کچھ منزلیں طے بھی کر بیٹھے ہوں' کچھ امتحانات پاس بھی کر چکے ہوں' کچھ آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ نکل بھی آئے ہوں' اب اُن پر شیطان کا کوئی اور وار کارگر نہیں ہوگا' اُن کے لیے شیطان کے پاس بہت بڑا ہتھیار تکبر کا ہے۔ یہ انتہائی مہلک ہتھیار ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ))(۱۰) ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہے۔''

تکبر اقامتِ دین کی راہ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہ پندار کہ میں نے اِس راہ میں یہ کچھ کھپا دیا' میں نے تو بہت دولت صرف کر دی' اپنی جوانی کھپا دی' اپنی توانائیاں لگا دیں' یہ چیز تکبر کی بنیاد بن جائے گی۔ اِس کے برعکس یہ خیال ہو کہ یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے' اُس نے اپنی راہ میں خدمت کے لیے آسانی پیدا فرمائی ہے' اُس نے خدمتِ دین کے لیے مواقع پیدا فرما دیئے' وہ مواقع اگر نہ ملتے تو نہ معلوم ہم کہاں بھٹک رہے ہوتے' کس نالی میں گرے ہوتے! آخر شراب پی کر نالیوں میں گرے ہوئے لوگ بھی تو ملتے ہیں' وہ بھی انسان ہیں۔ پتا نہیں کس وقت اُس کا پاؤں پھسل گیا اور ایک مرتبہ کی لغزش اُسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ ہماری نہ معلوم کتنی لغزشیں ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہے' کتنی خطائیں ہیں جن

سے درگزر فرمایا ہے۔ اب اگر احساس ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے' اِس میں میرا کوئی ذاتی استحقاق نہیں تھا' جو کچھ ملا ہے صرف اُس کی عطا' اُس کا فضل اور اُس کی دین ہے' تو انسان تکبر سے بچ جائے گا اور اُس میں عاجزی و احسان مندی کے جذبات پیدا ہوں گے۔

• آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۵۴﴾ ''اور اللہ بہت وسعت والا' جاننے والا ہے''۔ اللہ کی یہ صفت کہ وہ بہت وسعت والا ہے حسد کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے تو اُس سے حسد نہ کرو! اللہ کے فضل کا خزانہ محدود نہیں ہے۔ اُس سے مانگو وہ تمہیں بھی دے گا۔ اِس راستے میں آ کر بربادی کا جو اصل سبب بنتا ہے وہ اولاً تکبر اور ثانیاً حسد ہے۔ حدیث نبوی ﷺ کے مطابق حسد نیکیوں کو اِس طرح مٹا دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا دیتی ہے۔ حسد یہ ہے کہ جلن ہو کہ اللہ نے اُسے یہ نعمت کیوں دے دی؟ لیکن جب یہ خیال ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے جو اُس پر ہوا ہے' اللہ نے اُسے چن لیا ہے' یہ اُس کی دین ہے تو اب حسد پیدا نہیں ہوگا۔ جو اللہ اُسے دے سکتا ہے وہ تمہیں بھی دے سکتا ہے۔ اُس کا خزانہ خالی تو نہیں ہو گیا! تم بھی اُس سے مانگو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ ہیں کہ دستک دو' کھولا جائے گا' مانگو' دیا جائے گا..... تم میں سے کون ایسا ہے کہ اُس کا بیٹا اُس سے مچھلی مانگے اور وہ اُسے سانپ پکڑا دے! تم اپنی اولاد کے ساتھ اگر یہ نہیں کرتے تو کیا وہ تمہارا آسمانی باپ تمہیں محروم رکھے گا؟ اُس کا خزانہ تو لامحدود ہے۔ اُس سے مانگو' وہ تمہیں دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو ایک پہلو سے نواز دے اور دوسرے کو کسی دوسرے پہلو سے سرفراز کر دے۔

• صفت ''علیم'' میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جس کو جو کچھ دیتا ہے اپنے علم کی بنیاد پر دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس شے کا اہل ہے۔ بسا اوقات کسی کو دولت سے محروم کرنا اُس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے کہ یہ کمزور ہے' اپنی خواہشات پر قابو نہیں رکھ سکتا' دولت کی فراوانی ہوگی تو عیاشیوں میں مبتلا ہو جائے گا' اُس سے دولت کا روک لینا اور رزق میں تنگی کر دینا اُس کے لیے خیر ہے' شر نہیں۔ تو وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر کرتا ہے کہ کسے کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا' کون کس چیز کا اہل ہے اور کس چیز کا اہل نہیں ہے۔ چنانچہ جو مانگنا ہے اُسی سے مانگو' البتہ اِس پر راضی بھی رہو کہ جو اُس نے ہمیں دیا ہے یقیناً یہی ہمارے لیے خیر ہے۔

حرفِ آخر:

منتخب نصاب کے اِس درس میں اُن لوگوں کے مطلوبہ اوصاف سامنے آگئے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے مال و جان لگانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ آئیڈیل اوصاف ہیں جو ہمیں پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ یہ اقامتِ دین کی راہ کے مسافروں کے لیے زادِراہ ہے اور اِس مشن کے لیے کمر ہمت کسنے والوں کے لازمی اوصاف ہیں۔ اگر ہم اِس معیار پر اپنے آپ کو پورا نہیں پا رہے ہیں تو اپنی کوتاہی کا احساس رہے گا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں!

آئیڈیل اوصاف مسخ نہ ہونے پائیں۔ اگر ہم اِس آئیڈیل کو بدل دیں گے تو پھر نہ اصلاح کا کوئی امکان رہے گا اور نہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہے گی۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا زِدْنَا اِیْمَانًا وَّھُدًی وَّعِلْمًا نَافِعًا وَّعَمَلًا صَالِحًا مُّتَقَبَّلًا..... آمین!

حواشی

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق۔

(۲) مسند احمد، ح:۲۱۰۲۱، راوی : معاذ بن جبلؓ - ومؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء فی المتحابین فی اللّٰه، ح : ۱۵۰۳۔

(۳) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فی فضل الحب فی اللّٰه۔

(٤) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون .....

(٥) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه۔

(٦) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل .....

(۷) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه ﷺ، باب منه۔ ح:۲٤۰۹۔

(۸) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللّٰه ﷺ، باب فیمن سب اصحاب النبی ﷺ۔

(۹) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰه تعالیٰ ویحذرکم اللّٰه نفسه۔

(۱۰) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه ﷺ، باب ما جاء فی الکبر۔

الجہاد فی الاسلام

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے جامع ہدایات دیتا ہے۔ اسلام امن کا دین ہے۔ امن کے قیام کے لیے اجتماعی اور منظّم جِدّوجُہد ضروری ہے۔ اس جدّوجہد کے نتیجے میں عوام الناس سکھ کا سانس لیں گے۔ چونکہ معاشرے میں قیامِ امن کے لیے شریعت اسلامی کا نفاذ ضروری ہے' اس لیے مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کے تحت اسلامی زندگی نہیں گزار سکتے ہیں۔ اسلامی احکام پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان پورے طور پر آزاد ہوں۔ لہٰذا اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے ٹھوس بنیادوں پر جدّوجہد کرنا ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہے۔

جہاد ہر اس سعی و جُہد کو کہتے ہیں جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کی جائے۔ اسی لیے جہاد کا آغاز ہر مسلمان اپنی ذات سے کرے گا' حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کو اپنے لیے لازم ٹھہرائے گا اور پھر دوسروں کو اس کی ترغیب دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی نجات صرف دین اسلام کے قبول کرنے میں ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵) ''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا''۔ چنانچہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کی خاطر مسلمان کوشش کریں گے کہ سب لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں' لیکن ایسا ہونا آسان نہیں' کیونکہ اسلام کے علاوہ دوسرے کئی نظریات انسانوں نے پیدا کر رکھے ہیں جن کے ساتھ ان کے دنیوی مفادات وابستہ ہیں اور وہ ان مفادات کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔ پھر شیطان اولادِ آدم کا ازلی دشمن ہے' وہ نہیں چاہتا کہ انسان نجات کا راستہ اختیار کرے۔

دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد زبان سے بھی کی جاسکتی ہے' قلم سے بھی' مال سے بھی اور ضرورت ہو تو تلوار سے بھی۔ زبان کا جہاد یہ ہے کہ انسان دوسرے لوگوں کو زبان سے

سمجھائے بجھائے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے اور اُن کو اس کے فوائد ذہن نشین کرائے۔ جہاد بالقلم یہ ہے کہ اپنی تحریروں کے ذریعے مخلوقِ خدا کو خدا کے احکام سے واقف کرے اور یہ باور کرائے کہ خالق کے احکام انسانوں کے بنائے ہوئے ضابطوں پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ جہاد بالمال یہ ہے کہ اپنا مال دین کی سربلندی کے لیے خرچ کرے' یعنی اُن تحریکات اور سرگرمیوں میں مالی تعاون پیش کرے جن کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ جہاد بالسیف جہاد کی آخری صورت ہے جس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب نفاذِ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں' مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جائے' کفر کی بالادستی قائم کرنے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کارروائیاں کی جائیں۔ اس وقت ضروری ہوگا کہ کفر کی سیاسی اور عسکری قوت کو توڑا جائے تاکہ وہ اپنے شیطانی عقائد واعمال پھیلانے کے قابل نہ رہے۔ البتہ جو لوگ اپنے غلط عقیدوں پر قائم رہنا چاہیں انہیں قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا' مگر انہیں اس بات کی اجازت بھی نہ ہوگی کہ وہ اپنے باطل عقائد ونظریات دوسروں میں پھیلائیں۔

ایسا بھی ہوگا کہ کفر کی طاقت اسلامی علاقے پر حملہ آور ہو جائے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں ان کے خلاف مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا جائے گا۔ اس جہاد کا مقصد نہ مالی فوائد حاصل کرنا ہوگا نہ کوئی دنیوی منافع' بلکہ اس کا مقصد کفر کے غلبے کا توڑ اور اسلام کو سربلند کرنے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

اہل اسلام کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں عزت اور وقار کی زندگی گزارنے کے لیے اور آخرت میں اعزاز واکرام پانے کے لیے ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہیں اور اس ضمن میں کسی غفلت اور سستی کا شکار نہ ہوں' اگر ایسا نہ ہوا تو ذلّت اور خواری ان کا مقدّر بن جائے گی اور وہ جان جس کو بچانے کے لیے انہوں نے جہاد سے گریز کیا وہ ذلیل وخوار ہو کر زندہ رہے گی اور آخرت کا خسارہ عذاب کی صورت میں ان کے حصہ میں آئے گا۔

مجاہدانہ زندگی بسر کرنا رسول اللہ ﷺ کا مشن تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے واحد پسندیدہ دین کو غالب کرنے میں لگے رہے۔ آپؐ نے اس فرض کی ادائیگی میں کما حقّہ جدوجہد کی یہاں تک کہ الرفیق الاعلیٰ سے جا ملے۔ رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آپؐ کے مشن کی تکمیل میں لگ جائے۔ اس مقصد کی خاطر جو بھی جدوجہد کی جائے گی وہ جہاد کہلائے

گی۔ جہاد کے بغیر مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی زندگیاں سراسر جہاد تھیں۔ وہ ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے حکم کے منتظر رہتے تھے کہ کب جہاد کے لیے نکلنے کا اعلان ہو اور وہ اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے چل پڑیں۔ جذبۂ جہاد اُن لوگوں کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جہاد کے بارے میں قرآن مجید کی بہت سی آیات اُن کے سامنے موجود تھیں۔ سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲﴾

''اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا' وہی کامیاب ہیں۔ اُن کا رب انہیں اپنی رحمت' خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔''

پھر اسی سورت میں مسلمانوں کی زندگی میں جہاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾

''کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اُس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسولؐ اور مؤمنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

گویا جہاد کے بغیر زندگی گزارنا حقیقی فوز و فلاح کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ))(۱)

''جو شخص اس طرح مر گیا کہ نہ اس نے کبھی جہاد کیا اور نہ اپنے دل کے ساتھ کبھی اللہ کی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔

راہ میں لڑنے کے بارے میں بات کی تو وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔''

الغرض جہاد ایک مسلمان کی ہر وقت کی تمنا ہے۔ اگر اس تمنا کے بغیر دنیاوی لذات میں گم ہو کر زندگی گزار دی تو گویا یہ زندگی مؤمنانہ نہیں بلکہ منافقانہ ہے۔ مسلمان کو تو جذبۂ جہاد سے سرشار رہنا چاہیے اور شہادت کی تمنّا کرنی چاہیے کہ شہادت کی موت تو دنیا کی خوشحال اور نعمتوں بھری زندگی سے کروڑوں گنا سے بھی زیادہ پُرکشش' لذیذ اور خوبصورت زندگی کا باعث بنے گی۔ اللہ کی راہ میں جان دینے والا شہید ہے اور شہید کے لیے جنت کا وعدہ ہے اور جنت وہ مقام ہے کہ اس کی نعمتوں کی حقیقت جاننا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ شہید کو دوزخ کی آگ سے محفوظ و مامون رکھا جائے گا۔ حضرت ابوعبس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَمَسَّہُ النَّارُ)) (۱)

''یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی بندے کے قدم راہِ خدا میں چلنے سے گرد آلود ہوئے ہوں پھر ان کو دوزخ کی آگ چھو سکے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا یہ حال تھا کہ خود اپنے لیے شہادت کی شدید تمنا رکھتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ لَا اَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَا تَطِیْبُ اَنْفُسُھُمْ اَنْ یَتَخَلَّفُوْا عَنِّیْ وَلَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُھُمْ عَلَیْہِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِیَّۃٍ تَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۲)

''اُس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ بہت سے اہل ایمان کے دل اس پر راضی نہیں کہ وہ جہاد کے سفر میں میرے ساتھ چلنے سے پیچھے رہ جائیں اور میرے پاس ان کے لیے سواریوں کا انتظام نہیں ہے (اگر یہ مجبوری حائل نہ ہوتی) تو میں راہِ خدا میں جہاد کے لیے جانے والی ہر جماعت کے ساتھ جاتا (اور جہاد کی ہر مہم میں حصہ لیتا)۔ قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے' میری دلی آرزو ہے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کر دیا جائے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب من اغبرت قدما فی سبیل اللّٰه۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰه۔

اور میں پھر شہید کیا جاؤں' اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندگی عطا فرمائی جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں۔''

رسول اللہ ﷺ شہادت کی موت کی فضیلت سے کما حقہ آگاہ تھے اس لیے وہ اپنے لیے شہادت کی تمنا رکھتے تھے' مگر آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ تو شہادت کی موت کے بغیر ہی بہت بلند تھا۔ آپؐ تو امام الانبیاء تھے' حامل مقامِ محمود تھے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے کے مطابق آپؐ کی وفات تو بیماری سے ہوئی' مگر آپؐ نے شہادت کی موت کی فضیلت پورے طور پر واضح فرما دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا اَحَدٌ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ یُحِبُّ اَنْ یَّرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَهٗ مَا عَلَی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا الشَّهِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا فَیُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا یَرٰی مِنَ الْکَرَامَةِ)) (۱)

''جنت میں پہنچ جانے کے بعد کوئی شخص بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں اس حال میں واپس کر دیا جائے کہ دنیا کی ساری چیزیں اس کی ہوں (وہ سب کا مالک ہو) البتہ جو راہ خدا میں شہید ہو کر جنت میں پہنچے گا وہ اس کی آرزو کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں واپس کر دیا جائے اور وہ پھر (ایک دفعہ نہیں) دس دفعہ راہ خدا میں شہید کیا جائے..... وہ یہ آرزو اس لیے کرے گا کہ جنت میں دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہیدوں کا کیسا اکرام و اعزاز ہے (اور وہاں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے)۔''

موت وہ اٹل حقیقت ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ پھر موت کے بعد حقیقی اور نہ ختم ہونے والی زندگی شروع ہو جائے گی جس میں یا تو لذت' چین' سکون اور ہر طرح کی نعمتیں ہوں گی یا بداعمالی کی سزا کے طور پر آگ کا عذاب ہو گا۔ اس دنیا میں انسان حق کا ساتھ دیتے ہوئے صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس راستے میں اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی ہیں مگر وہ صبر سے کام لیتا ہے تا کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچا رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے' انتہائی کوشش کے باوجود اُس سے گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔ شہید فی سبیل اللہ کو دوزخ کے عذاب سے بچاؤ اور جنت میں داخلے کی بشارت ہے اور جس کو اگلی زندگی کا سکھ اور چین ملا اُس کو اور کیا

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب تمنی المجاهد ان یرجع الی الدنیا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الشهادة فی سبیل اللّٰه تعالیٰ۔

چاہیے؟ چنانچہ جب شہید فی سبیل اللہ کو جنت ملے گی تو وہ تمنّا کرے گا کہ اسے بار بار زندہ کر کے شہادت کی موت مارا جائے۔ یہ اس لیے کہ وہ شہادت کی لذّت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی نعمتوں سے متمتّع ہو چکا ہوگا اور اس کے لیے جانکنی کا مرحلہ انتہائی آسان ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا يَجِدُ الشَّهِيْدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ اِلَّا كَمَا يَجِدُ اَحَدُكُمْ مِنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ)) (۱)

''راہِ خدا میں شہید ہونے والا بندہ قتل کیے جانے کے بعد بس اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی آدمی چیونٹی کے کاٹ لینے کی محسوس کرتا ہے۔''

جو شخص جہاد فی سبیل اللہ میں نکلتا ہے اس کو اس شخص کے برابر اجر ملتا ہے جو دن کو روزہ رکھتا ہو اور رات بھر عبادت کرتا ہو۔ پھر اگر وہ مجاہد فی سبیل اللہ بیمار ہو کر بھی فوت ہو جائے تو اسے شہادت کا مقام عطا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اس عمل کو کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو یا تین مرتبہ یہ سوال کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ تم لوگ اس عمل کو کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ تیسری دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو ہمیشہ روزے سے رہے' رات بھر عبادت کرتا رہے' اللہ کے احکام کی تعمیل میں مصروف رہے' روزے اور نماز (میں مسلسل مصروف رہے' ان) سے (ذرا بھی) سست نہ ہو' یہاں تک کہ مجاہد فی سبیل اللہ (جہاد سے) واپس لوٹ آئے۔ (مسلم)

اسلام کی سربلندی کے لیے کی جانے والی ہر کوشش خواہ زبان سے ہو یا قلم سے' ہاتھوں سے ہو یا پاؤں سے' دل سے ہو یا دماغ سے' تیر سے ہو یا تلوار سے' وہ جہاد ہے جس کے بغیر کسی کا اسلام معتبر ہے نہ ایمان۔ لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے اور اس بات سے کبھی بے خبر نہ ہو کہ وہ فریضۂ جہاد سے عہدہ برآ ہو رہا ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد نہ صرف ایک مسلمان کی تمنا اور آرزو ہے بلکہ اُس کے ایمان و اسلام کا ٹیسٹ ہے۔

❁❁❁

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل الجهاد عن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم' باب ما جاء فی فضل المرابط۔

سیرتُ النّبی ﷺ کا پیغام اور آیتِ اظہارِ دین

حافظ محمد مشتاق ربانی

نبی اکرم ﷺ کے خصائص، فضائل اور شمائل تو بکثرت بیان کیے جاتے ہیں، لیکن عام طور پر سیرت کے اصل پیغام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارے ہاں مطالعۂ سیرت کے مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ سیرت نبویؐ سے دلچسپی محض حصولِ ثواب کے لیے رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو آنحضور ﷺ کا یومِ پیدائش تو بڑے اہتمام سے مناتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو آپ ﷺ کے پیغام کو ایک مکمل نظامِ حیات سمجھنے کی بجائے اسے چند عبادات اور وظائف تک محدود کر دیتے ہیں، حالانکہ آپؐ کی سیرت محض علم وادب کی تفریحی سیر گاہ نہیں، بلکہ ایک تاریخی قوت کی داستان ہے۔ دوسری طرف سیرت کے اس عملی پہلو پر اس قدر زور بھی نہیں دیا جانا چاہیے کہ آپؐ کی شخصیت کا روحانی پہلو نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ لہٰذا عملی اور روحانی پہلو میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ امام ترمذی (ت ۲۷۹ھ) نے ''الشمائل النبوية'' میں جو ہمارے ہاں ''شمائلِ ترمذی'' کے نام سے مشہور ہے، جہاں باب ''ما جاء في شعر رسول اللهﷺ'' میں رسول اللہ ﷺ کے سر اقدس کے بالوں کا ذکر کیا وہاں آپ نے باب ''ما جاء في صفة سيف رسول اللهﷺ'' میں رسول کریم ﷺ کی تلوار کے بارے میں بھی بیان کیا ہے۔ اگر ہم آپؐ کی سیرت کا اصل اور حقیقی پیغام سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جاننا چاہیے کہ ایک کامیاب انسان کی زندگی نہایت مربوط شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد سامنے رکھنا ہوگا۔ نعیم صدیقی مرحوم اپنی کتاب ''محسنِ انسانیتؐ'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''ہم سیرت پاک کو مربوط نہیں کر سکتے، واقعات کی توجیہہ نہیں کر سکتے، مطالعہ سیرت کا مقصد متعین نہیں کر سکتے، اور اس سے کچھ اخذ نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ہم آنجناب ﷺ کے کام کی نوعیت، اس کے امتیازی پہلوؤں اور اس کے دائرہ کی وسعتوں کو پیش نظر نہ رکھ لیں۔''

اس بات کو سیرت کے ایک واقعہ کی روشنی میں سمجھیں کہ صلح حدیبیہ ۶ ہجری میں ہوئی۔ ۸ھ میں قبیلہ بنو بکر جو قریش کا حلیف تھا' اس نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ آپؐ نے بنو خزاعہ کی حمایت کے لیے قریش کے سامنے تین شرائط پیش کیں:

۱) بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کرو۔

۲) پہلی شرط منظور نہیں' تو بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جاؤ۔

۳) اگر پہلی دو شرائط میں سے کوئی منظور نہیں تو صلح حدیبیہ کے ختم کرنے کا اعلان کر دو۔

قریش نے تیسری شرط کو قبول کر لیا' لیکن بعد میں انہیں احساس ہوا کہ مسلمانوں سے صلح رہنی چاہیے۔ اب صلح کی بحالی کے لیے ابوسفیان' جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے' خود مدینہ منورہ جا کر کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے ہیں' وہ اپنے باپ ابوسفیان کو شرک کی وجہ سے نجس سمجھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے بستر کو لپیٹ دیتی ہیں۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا اس معاملے میں جو رویہ تھا اس کے بارے میں سیرت ابن ہشام میں ہے: **فلم یردّ علیه شیئا** ''آپؐ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا''۔ پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں: ''**مَا اَنَا بِفَاعِلٍ**'' میں تو رسول اللہ ﷺ سے ایسی بات نہیں کہوں گا''۔ پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آتے ہیں تو وہ حیرت سے فرماتے ہیں: **انا اشفع لکم الی رسول اللّٰہ؟** کیا میں آپ لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ سے سفارش کروں گا؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بات کی تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسا معاملہ درپیش ہے کہ ہم ہرگز آپؐ سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر حضرت علیؓ کے بیٹوں کو اس معاملے میں لانا چاہتے ہیں لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میرے بچوں کا صلح کی بحالی کے معاملے سے کیا تعلق ہے؟ آخر کار ابوسفیان اپنی تمام تر کوششوں میں ناکام ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے یک طرفہ صلح کی بحالی کا اعلان کر کے مکۃ المکرّمہ چلے گئے۔

اس واقعہ کے تناظر میں دیکھیں کہ ایک طرف صلح کے لیے آپؐ مخالف فریق کی تمام شرائط مان رہے ہیں اور دوسری طرف صلح کی بحالی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بظاہر یہاں ایک بڑا تضاد سامنے آتا ہے' جو دراصل ''انقلاب'' کے مراحل و لوازم کے تقاضوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ ہمیں سیرتِ رسول ﷺ کا صحیح فہم اُس وقت حاصل ہوگا جب ہم اس بات کو پیش نظر

رکھیں کہ آپؐ ایک صالح انقلاب برپا کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اسی انقلاب کے ضمن میں قرآن حکیم کا واضح ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴿۳۳﴾﴾ (التوبہ) ''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت تامہ اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے‘ اگر چہ مشرک ناخوش ہوں''۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۃ الصّف کی آیت ۹ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ میں بھی بیان ہوا ہے‘ لیکن سورۃ الفتح میں ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کی بجائے ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

یہ آیات سیرتِ سرورِ عالم ﷺ کا پیغام متعین کرتی ہیں۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ نے سیرت النبی ﷺ پر ''الرحیق المختوم'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو رابطہ عالمِ اسلامی کے زیر اہتمام ۱۳۹۶ھ کے مسابقہ (مقابلہ) میں اول انعام کی مستحق ٹھہری۔ اس کے آغاز میں مؤلف نے ایک شذرہ لکھا جس میں اس تالیف کے سبب کا ذکر کیا۔ اس ''کلمة المؤلف'' کا آغاز موصوف نے آیت اظہارِ ین کے الفاظ سے یوں کیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت سیرت کے حقیقی پیغام کو سمجھنے میں نہایت اہم ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اس آیت کے بنیادی اجزاء پر مختصر کلام کیا جائے۔

الْهُدٰى: اس سے مراد قرآن حکیم ہے‘ جیسا کہ علامہ زرکشی نے البرھان فی علوم القرآن (۱/۲۷۳) میں قرآن حکیم کے ۵۵ نام نقل کیے ہیں جن میں سے ایک الھدیٰ ہے۔ قرآن حکیم کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ﴿۳﴾﴾ (لقمٰن) ''یہ (کتاب) احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

دِيْنِ الْحَقِّ: ایسا دین جو سچا ہے۔ اس سے مراد دینِ اسلام ہے‘ جیسا کہ ابوحیان الاندلسی نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط فی التفسیر'' میں اس سے دین اسلام مراد لیا ہے اور بطور دلیل یہ آیت ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) نقل کی ہے۔ ''دین'' سے مراد نظامِ زندگی ہے‘ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (یوسف:۷۶) ''وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو پکڑنے کا مجاز نہ تھا''۔ مولانا مودودیؒ اپنی کتاب سیرتِ سرورِ عالم ﷺ میں لکھتے ہیں: ''دین کا لفظ عربی زبان میں اس نظامِ

زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔''

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى: ''اَظْهَرَ عَلٰی'' کا معنی غالب کرنا یا اطلاع دینا کے ہیں۔ غلبہ کے مفہوم میں لسان العرب (۵۲۳/۴) میں یوں مستعمل ہے: اَظْهَرَ اللّٰهُ الْمُسْلِمِينَ الْكافِرِينَ ''اللہ نے مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ دیا''۔ گویا اس کے مادہ میں قوت و طاقت کا عنصر شامل ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى کو اگر اطلاع دینے کے معنی میں لیا جائے تو مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو تمام ادیان کے بارے میں بتلا دیں گے' یہاں تک کہ آپؐ تمام ادیان کے باطل ہونے کے بارے میں جان جائیں گے' اور اس پہلو سے بھی مطلع ہو جائیں گے جو انہوں نے اپنے ادیان میں تحریف کی ہوگی۔ خود قرآن حکیم میں ایک مقام پر واضح طور پر يُظْهِرُ عَلٰى اطلاع کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ (الجن) اگرچہ اَظْهَرَهٗ عَلَى میں اطلاع کر دینے کا مفہوم موجود ہے لیکن مفسرین کرام نے آیت اظہار دین میں عموماً غالب کرنے کے مفہوم کو بیان کیا ہے۔

لیظھرہ میں ضمیر منصوب ''ہ'' رسول اللہ ﷺ اور دین الحق دونوں کے لیے ہے' جیسا کہ علامہ زمخشری نے الکشاف میں تحریر کیا ہے۔ ابوحیان نے ''البحر المحیط'' میں اسے رسول اللہ ﷺ کے لیے ذکر کیا ہے۔ ابن عادل الدمشقی نے اپنی تفسیر اللباب میں بیان کیا ہے کہ اس بات کا اصل مرجع مفسّر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں کہ ضمیر منصوب ''ہ'' رسول کریم ﷺ کے لیے ہے۔ بہرحال ضمیر منصوب ''ہ'' سے مراد دین الحق ہو یا رسول اللہ ﷺ مفہوم و مدعا دونوں کا ایک ہی ہے۔

الدِّين: الدین میں الف لام ''جنس'' کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے اس کا ترجمہ تمام ادیان سے کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ اور بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ جنسِ دین سے کیا ہے جس سے مراد تمام ادیان ہی ہیں۔

كُلِّهٖ: یہ دین الحق کے لیے تاکید ہے' یعنی سارے کا سارا دین۔

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ: ''اور چاہے مشرکوں کو ناگوار ہو''۔ اس میں اشارہ ہے کہ دین مصطفوی ہر صورت میں قائم ہو کر رہے گا' جس کا غلبہ مشرکین اور کفار کو ناگوار گزرے گا۔ یہ مختصر سا جملہ اپنے اندر یہ مفہوم بھی لیے ہوئے ہے کہ اس دین کے غلبہ کے لیے مشرکین سے تصادم

ناگزیر ہے۔ مشرک کبھی پسند نہیں کریں گے کہ اللہ کا دین قائم ہو۔ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾﴾ (الفتح) ''اور کافی ہے اللہ بطور گواہ''۔ یعنی اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو گواہ بنایا ہے کہ وہ رسول ﷺ یا دینِ اسلام کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کو خواہ کتنا ہی بعید از قیاس سمجھیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔

آیت اظہارِ دین مستقبل کی نوید ہے۔ اس میں مکہ فتح ہونے کی بھی پیشین گوئی ہے جسے آنجناب ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیا، لیکن عہد رسالت میں تمام ادیان اسلام کے زیر نگیں نہیں ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نورِ توحید کا پوری طرح جگمگانا ابھی باقی ہے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں بیان کیا ہے:

> ''دینِ حق خود آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں باقی تمام دینوں پر کلی طور پر غالب نہیں آیا، کیونکہ ابھی نصاریٰ اور مجوس اپنے طمطراق کے ساتھ قائم تھے۔ اس لیے عام مفسّرین اس آیت کی تفسیر سے عاجز رہے۔ چنانچہ ضحاک کہتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگا۔ حسن بن فضل کا قول ہے کہ واضح دلائل سے غالب کرنا مراد ہے۔ البتہ امام شافعیؒ نے ان سب لوگوں سے زیادہ مضبوط بات پیش فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو تمام دینوں پر غلبہ دیا۔ جس نے سنا اُسے یقین ہوگیا کہ یہ دین سچا ہے اور اس کے خلاف جو کوئی بھی ہے وہ باطل پر ہے۔ دنیا میں شرک کا مجمع دو ہی دینوں میں ہے: اہل کتاب کے دین میں اور اُمیوں کے دین میں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اُمیوں پر غلبہ پالیا، یہاں تک کہ وہ اس کے تابع ہوگئے اور بعض اہل کتاب نے بھی مغلوب ہوکر جزیہ دینا قبول کرلیا اور ان پر اس دین کا قانون نافذ ہوگیا۔ تمام دینوں پر اس دین کے غلبے کے یہی معنی ہیں۔ یہ فقیر (یعنی شاہ صاحب مرحوم) عرض پرداز ہے ان سب صحیح احادیث کا لُبِّ لباب یہ نکلا کہ دین کا کامل غلبہ آنحضرت ﷺ کے بعد ہوگا۔''

اس موقع پر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل جو نظامِ خلافت قائم ہوگا وہ عالمی ہوگا یا جزوی! اس مسئلے میں بعض اہل علم کی رائے ہے کہ وہ عالمی نہیں ہوگا، لیکن علماء کی

اکثریت اس پر متفق ہے کہ وہ عالمی ہوگا۔ جیسا کہ آیت اظہار دین میں لفظ ''الدین'' میں ''لام'' جنس ہے جس کا مفہوم تمام ادیان اور تمام نظام ہائے زندگی کو شامل ہے جس کو ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں۔ قرآن حکیم کی کئی آیات متقاضی ہیں کہ یہ غلبہ عالمی ہوگا' جیسا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں کے لیے رسول ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸) ''کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں''۔ اسی طرح آپؐ سب کے لیے باعث رحمت ہیں: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء) ''اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ آپؐ کا سب کے لیے رسول اور باعثِ رحمت ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خلافت عالمی ہوگی۔ اسی طرح کئی احادیث نبویہ جو طوالت کی بنا پر ذکر نہیں کی جا سکتیں' ان کے مفہوم کے مطابق اس سے تمام روئے زمین مراد ہے۔ جیسے مسند احمد میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی نقل ہوا ہے:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ.....))

''روئے زمین پر نہ تو کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام داخل نہ کر دے.....''

اوپر بیان کردہ تصریحات سے پتا چلتا ہے کہ یہ خلافت انسانیت کا مقدر ہے۔ اب ہمارے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس راستے میں اپنے حصے کی شمع روشن کر دیں جس سے ہم سرخرو ہو جائیں گے۔ اس نظام خلافت کے قیام کے سلسلے میں جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں تاکہ سیرت کے اصل پیغام یعنی غلبۂ دین کی راہ ہموار ہو سکے!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

غرور وتکبّر

بنتِ مُحیٰی

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت سے ہی ہوا تھا۔ انسان اوّل روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کامل انسانی شعور کے ساتھ کی تھی۔ انسان کو جو چیز باقی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی اخلاقی ذمّہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہے جسے اللہ نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔

تین اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے کوئی بھی چیز گناہ بن جاتی ہے اور انسان ان اسباب کی وجہ سے گناہگار بن جاتا ہے۔ کسی بھی چیز کو گناہ بنانے کا پہلا سبب حق تلفی ہے' چاہے یہ حق تلفی خالقِ کائنات کی ہو یا مخلوقاتِ کائنات میں سے کسی کی' یعنی والدین کی یا کسی دوسرے انسان کی' حتیٰ کہ اپنے نفس کی حق تلفی بھی گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ظلم اور شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳﴾ (لقمٰن) اب جس کا حق جتنا زیادہ ہوگا اس کو تلف کرنے کا گناہ بھی اتنا زیادہ ہوگا۔

گناہ کا دوسرا سبب اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں استکبار ہے' جس کی وجہ سے انسان اللہ کے اوامر ونواہی کی پروا نہیں کرتا' نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرتا ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عمداً ان کاموں کو نہیں کرتا جن کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ اب یہ نافرمانی جس قدر ڈھٹائی' جسارت اور ناخداترسی کی کیفیت پر مبنی ہوگی' گناہ بھی اسی قدر بڑا ہوگا۔

گناہ کا تیسرا سبب انسان کی وہ ذہنی کیفیت ہے جس کی بنا پر وہ اپنے سے اعلیٰ شخص کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا' اُسے وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس

کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس سے اسے ایک گونہ طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے خیالات کوئی اخلاقی عیب نہیں ہیں۔ لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جائے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے سے حقیر سمجھنے لگے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔ اس کائنات کا پہلا گناہ جو ابلیس سے سرزد ہوا وہ تکبر ہی تھا جس کی بنا پر اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سربسجدہ ہونے سے انکار کیا اور ملعون ہو کر جنت سے دھتکارا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ قدسی ہے:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ)) (۱)

''کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا لباس' جس نے مجھ سے ان میں سے کسی ایک پر جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔''

تکبّر دین کو برباد' عقل کو کم اور عزّت کو تباہ کرنے والا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ : شُحٌّ مُطَاعٌ ، وَهَوًى مُتَّبَعٌ ، وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ))(۲)

''تین چیزیں تباہ و برباد کرنے والی ہیں: (۱) وہ بخل جس کی اطاعت کی جائے۔ (۲) وہ خواہش جس کی اتباع کی جائے۔ (۳) انسان کا اپنے نفس پر تکبر کرنا۔''

کبر و عُجب تمام فضائل کو تباہ کر دیتے ہیں اور رذائل کا باعث بنتے ہیں۔ یہی ایک رذالت کافی ہے کہ انسان نصیحت کی بات نہ سنے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ اسے کہا جائے اللہ سے ڈرو اور وہ یہ کہے کہ جا اپنا کام کر!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ (قَالَ اَبُوْمُعَاوِيَةَ) وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: شَيْخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ)) (۳)

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب اللباس' باب ما جاء فی الکبر۔

(۲) حلیة الاولیاء لابی نعیم ۱۸۳/۲۔ وتخریج الاحیاء للعراقی ۳۳/۱۔ وصحیح الجامع الصغیر للالبانی' ح ۳۰۳۹۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار والمن بالعطیة۔

''تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا' نہ انہیں پاک کرے گا' نہ ان کی طرف رحمت سے دیکھے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: (۱) بوڑھا زانی' (۲) جھوٹا بادشاہ' (۳) متکبر فقیر۔''

ویسے تو تکبر اور غرور کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے لیکن ایک فقیر و نادار جو کبر و برتری کے اسباب سے ہی محروم ہے' وہ اگر تکبر کا اظہار کرے تو اس کا اظہارِ تکبر ایک مالدار کے اظہار سے زیادہ قبیح ہے اور یہ سراسر خشیتِ الٰہی سے بے نیازی اور احکامِ الٰہی سے روگردانی ہے۔ غرور و تکبر ایسا دھوکہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے بعد انسان سے خیر کی توقع کرنا عبس ہے۔ اس موذی مرض میں مبتلا ہو کر انسان دوسروں کے لیے بھی تباہی کا باعث بنتا ہے اور انجام کار خود بھی مہیب خطرات سے دوچار ہو جاتا ہے۔

خود پسندی (selfloving) کی صفت ترقی کر کے غرور کا لاعلاج مرض بن جاتی ہے۔ غرور و تکبر کی صفتِ رذیلہ یوں تو کسی بھی شخص میں کسی بھی سبب سے ہو سکتی ہے' مثلاً کسی کا حسن اسے مغرور بنا دیتا ہے' کوئی علم کے ہاتھوں متکبر ہو جاتا ہے' کوئی قوت و طاقت کے سبب کبر میں مبتلا اور کوئی اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر مغرور و متکبر ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اور سابقہ اقوام کے حالات و واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طاقت اور اقتدار ایسے اسباب ہیں جو انسان کو غرور و تکبر کی انتہا تک لے جاتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ہے' جیسے فرعون طاقت و اقتدار کے نشے میں یہ دعویٰ کر بیٹھا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾۔ اسی طرح شیطان ناری ہونے کے نشے میں اپنی برتری کا دعویٰ کرنے لگا۔

﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲﴾ (الاعراف)

''بولا میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔''

جبکہ اللہ تعالیٰ نے تکبر کو سخت ناپسند کرتے ہوئے انسان کو عاجزی و فروتنی اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷﴾ (بنی اسراء یل)

''زمین میں اکڑ کر نہ چلو' تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔''

بڑائی کا جھوٹا پندار' عزّت کا بے بنیاد اِدّعا اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھنا کسی کو بڑا اور ذی عزّت نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ چھوٹا' ذلیل اور

پست ہی بنائے گا۔اور انسان اپنی ذلت وخواری کا سبب خود ہی ہوگا۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ﴾

(الاعراف:١٤٦)

''میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔''

قرآن تکبر اور بڑا بننے کو اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو مقامِ بندگی سے بالاتر سمجھنے لگے' خدا کے احکام کی کچھ پروانہ کرے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گویا وہ نہ تو خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اُس کا رب۔اس خودسری کی کوئی حقیقت ایک پندار غلط کے سوا کچھ نہیں ہے' کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو بندے سے بڑھ کر کچھ سمجھے۔

استکبار کی حقیقت قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

﴿قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۲۲﴾ (النحل)

''ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑے ہوئے ہیں۔''

آخرت کے انکار نے ان کو اس قدر غیر ذمہ دار اور دنیا کی زندگی میں مست اور بے فکر بنا دیا ہے کہ انہیں کسی حقیقت کا انکار کر دینے میں باک نہیں رہا' کسی صداقت کی ان کے دل میں قدر باقی نہیں رہی اور کسی اخلاقی بندش کو اپنے نفس پر برداشت کرنے کے لیے وہ تیار نہیں رہے۔ایسے خودسروں کو اللہ بھی پسند نہیں کرتا۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳﴾ (النحل)

''یقیناً اللہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہوں۔''

احادیث میں بھی متکبرانہ انداز رکھنے والوں کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ وَاَبْعَدَكُمْ مِنِّيْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشِدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ))(٤)

''تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ دور رہنے

(٤) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' باب ما جاء فی معالی الاخلاق۔

والے وہ ہوں گے جو بہت باتونی' زبان دراز اور متکبرانہ انداز میں باتیں کرنے والے ہوں گے۔''

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ؟ قَالُوْا: بَلٰى! قَالَ: كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))(۵)

''کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر سرکش' بخیل اور متکبر جہنمی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنا محتاج پیدا کیا ہے اور دعا اسی محتاجی اور ضرورت کا اظہار ہے۔ اے اللہ ہم تیرے محتاج ہیں' ہم کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں' اصل مالک تو ہے' جب تک تو ہمیں عطا نہ کرے ہمیں کوئی کچھ نہیں دے سکتا۔ دُعا مانگنے سے انسان میں عاجزی وانکساری کی صفت پیدا ہوتی ہے اور انسان میں کبھی تکبر پیدا نہیں ہوسکتا' بایں طور کہ انسان سوچتا ہے کہ میں تو خود اللہ کا محتاج ہوں اور کبریائی کا اظہار تو صرف اس ذات کا حق ہے جو کسی کی محتاج نہ ہو۔ لیکن جب کوئی بندہ اپنی محتاجی کا اظہار نہ کرے' اپنی ضرورت کو اللہ کے سامنے پیش نہ کرے' اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرے' اللہ سے مانگے نہیں اس وقت تک اللہ اور انسان کے درمیان' خالق ومخلوق والا تعلق پیدا نہیں ہوتا اور انسان آہستہ آہستہ غرور وتکبر کی کیفیت میں مبتلا ہونا شروع ہو جاتا ہے' چنانچہ بعض انسان ترقی کرتے ہوئے ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کی کیفیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ دعا نہ کرنے کا اور اللہ کے سامنے سر نہ جھکانے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اللہ کی ضرورت نہیں' حالانکہ انسان اپنی ایک ایک سانس کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔

برائی کی ابتدا غرور سے ہوتی ہے۔ بندہ جب خود کو دوسروں کے مقابلے میں بڑی چیز سمجھتا ہے تو آپس میں جھگڑے لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں اور تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ تکبر میں مبتلا لوگ اپنا حق زیادہ جماتے ہیں' اپنے حقوق اوپر رکھتے ہیں' دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے (خیال تو دور کی بات دوسروں کے حقوق کو تسلیم ہی نہیں کرتے) انہیں صرف اور صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے' دوسرے سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ تکبر' اپنی بڑائی کا احساس اور اپنی من مانی کرنے کی شدید خواہش ہی فساد کی جڑ ہے۔

(۵) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب عتل بعد ذالك زنیم۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها' باب النار یدخلها الجبارون والجنة یدخلها الضعفاء۔

عملی زندگی میں ہمارے رویّے یہ ہوتے ہیں کہ مال نہیں ہے پھر بھی مالدار نظر آنے کا شوق ہے اور پھر اس شوق کو پورا کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس طرح انسان میں احساسِ کمتری کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر وہ مختلف قسم کے حربے استعمال کر کے اپنے احساسِ کمتری پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح متکبر شخص اندر سے وہ نہیں ہوتا جو باہر سے نظر آ رہا ہوتا ہے۔ یہیں سے منافقت جنم لیتی ہے اور دورُخا پن سامنے آتا ہے کہ ہے کچھ اور دکھائی کچھ دیتا ہے۔ نہ صرف مال دار بلکہ عالم' خوبصورت اور اسمارٹ نظر آنے کے لیے انسان کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ کپڑوں' پیسوں' زیورات کی باتیں کر کے خود کو مالدار ظاہر کرتا ہے۔ تکبر کی اصل اور بنیادی وجہ تعریف' شہرت اور دوسرے کے مقابلے میں بڑا اور اونچا بننے کا شوق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان نے جو کوئی چھوٹے موٹے اچھے کام کیے ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس چھوٹے سے کام کی وجہ سے اس کی تعریف کے پُل باندھیں' ہر وقت لوگ اسے یاد رکھیں اور وہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ تیسری وجہ تکبر کی یہ ہے کہ انسان صرف اپنے حقوق پر نظر رکھتا ہے اور اپنی حق تلفی اسے سخت ناگوار گزرتی ہے جبکہ دوسروں کے حقوق اسے زہر لگتے ہیں اور وہ ان حقوق کا ذرّہ بھر بھی خیال نہیں کرتا۔

آج کل تو اکثر و بیشتر شادیوں میں ایسا لباس ہوتا ہے جو خاصا لمبا ہوتا ہے۔ دلہن سجی بنی ایک خاص چال کے ساتھ چلتی اسٹیج پر آتی ہے اور پیچھے اس کا لباس اس کے ساتھ ساتھ زمین پر گھسٹتا چلا جاتا ہے' اور ہم واہ واہ کر رہے ہوتے ہیں کہ کیا شان ہے! کیا چال ہے! کیا خوبصورتی ہے! کتنی بڑائی ہے! ایسی چال اور ایسا لباس اللہ کو سخت ناپسند ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص اترا تا ہوا اپنے کپڑوں میں چلا جا رہا تھا۔ اس کے نفس نے اسے خود پسندی میں مبتلا کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ پس وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ اس حدیث میں قارون کی طرف اشارہ ہے۔ (صحیح بخاری)

تکبر کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ انسان ہر بات میں یہی سوچتا ہے کہ وہ ٹھیک اور حق پر ہے۔ بسا اوقات انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے مگر وہ اَنا اور تکبر کی وجہ سے اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنی غلطی پر اَڑ جاتا ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل میں دو گناہ اکٹھے ہو گئے: (۱) جانتے بوجھتے اپنی غلطی پر اَڑے رہنا (۲) دوسرے شخص کے حق پر ہونے کے باوجود اسے غلط کہنا۔

حضرت سلمٰی بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دائیں ہاتھ سے کھانے کو فرمایا۔ اس نے کہا مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھ سے یہ نہ ہو (اس نے محض تکبّر کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے کھانے سے انکار کر دیا۔) راوی نے بیان کیا ہے کہ اس کے بعد وہ آدمی اپنے دائیں ہاتھ کو منہ کی طرف کبھی نہیں اٹھا سکا۔ (مسلم)

تکبّر کا مطلب ہے لوگوں کو پست جاننا' کسی کے احسان کو نہ ماننا۔ اس لیے کہ جب کسی کا احسان مان لیا تو اس کو اپنے سے بہتر مان لیا' اس کو بڑا اقرار دیا تو خود چھوٹا ہو گیا۔ متکبر اپنے تئیں خود ہی بڑا ہوتا ہے' وہ احسان کرتا ہے تو جتاتا ہے' بڑا بنتا ہے۔ ہر برائی کی جڑ تکبر ہوتا ہے' ہر خرابی کا آغاز تکبر سے ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) (٦)

''کسی کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

کینسر ایک مہلک ترین بیماری ہے جو اندر ہی اندر انسان کو ختم کر دیتی ہے' انسان کو کھا جاتی ہے۔ جسم کے کسی بھی عضو میں کینسر کی تشخیص ہو جائے تو اس عضو کو جڑ سے کاٹنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر کینسر کے کچھ جراثیم بھی باقی رہ جائیں تو یہ کسی دوسرے عضو کو ضائع کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسی طرح تکبر اخلاقی اور روحانی کینسر ہے جو انسان کی آخرت جہنم بنا دیتا ہے اور دنیا میں بھی انسان اس اخلاقی کینسر کی سزا پا لیتا ہے اور اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ دنیا میں جسمانی کینسر کا علاج بھی جلانا ہے اور آخرت میں تکبر کا انجام بھی جلنا ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ۔ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ.....

آج کل گھروں میں اکثر جھگڑے ہوتے ہیں۔ شوہر بیوی' ساس بہو' نند بھاوج' دیورانی جٹھانی' حتیٰ کہ ماں باپ اور بچوں کے درمیان بھی جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی مرضی دوسرے پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہر ایک دوسرے کو اس کا مقام اور حق دینے کو تیار ہو جائے' ہر شخص اپنے مقابلے میں دوسرے کو بڑا سمجھے' اس کی خوبیوں پر نظر رکھے تو یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں۔ لیکن ہماری عادت یہ بن چکی ہے کہ ہم دوسروں کی خوبیوں کے بجائے ان کی خامیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اس طرح ہمارے دل میں ان کے لیے منفی سوچ پیدا ہوتی ہے جو بعد ازاں آپس کی لڑائیوں اور نفرت کا باعث بنتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود پسندی میں مبتلا شخص اپنے اردگرد کئی دیواریں کھڑی کر لیتا ہے جن کو پار کرنا لوگوں کے لیے ممکن

(٦) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم الکبر و بیانہ۔

نہیں ہوتا۔اس طرح اکٹھے اور پاس رہتے ہوئے بھی لوگ ذہنی طور پر ایک دوسرے سے دُور رہتے ہیں۔ بعد میں یہ دوریاں غلط فہمیوں کو پیدا کرتی ہیں' پھر نفرت کے جذبات اُبھرتے ہیں' بالآخر جھگڑے اور دشمنیاں جنم لیتی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلقات ختم ہو جاتے ہیں اور محبت وامن ناپید ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت تکبر سچائی سے انحراف اور حق کے انکار کا دوسرا نام ہے اور حق سے انکار انسان کو رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔جیسا کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ ماننے سے انکار کیا تو رسوا ہوا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (البقرۃ)

اس آیت میں شیطان کے حق کو ماننے سے انکار کا سبب تکبر بیان ہوا ہے۔یعنی شیطان نے یہ سوچا کہ اگر میں نے سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا تو اس سے میری بڑائی ختم ہو جائے گی۔بس یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے انکار کر دیا۔

انسان سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور کبھی انکار کی صورت بھی بن جاتی ہے۔اس کا حل یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے رب سے معافی مانگ لے۔معافی مانگنا درحقیقت اپنے انکار پر شرمندگی کا اظہار ہوتا ہے۔حضرت آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا کر غلطی کی اور شیطان نے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا۔لیکن حضرت آدمؑ نے اپنی غلطی پر معافی مانگی اور خلیفۃ اللہ بنے' جبکہ شیطان اپنے انکار پر اکڑ گیا تو ملعون ہوا۔

قیامت کے دن سب لبادے اتر جائیں گے' جو شخص جیسا ہے ویسا ہی نظر آئے گا' سب پردے ہٹ جائیں گے اور ہر ایک کی اصلیت بے پردہ ہو کر واضح ہو جائے گی۔ہمیں چاہیے کہ اس وقت سے پہلے ہم اپنا جائزہ لیں' اپنا احتساب کریں' اپنے اندر جھانکیں کہ کہیں ہم میں تو تکبر کے جراثیم تو نہیں ہیں۔اس کے لیے مندرجہ ذیل سوالات سے ہمیں اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز ہم میں تو نہیں۔ان سوالات کو اپنے نفس پر پیش کر کے ہاں اور نہ میں جواب لیجیے:

☆ میں خود کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہوں؟

☆ میں صرف اپنی ہی فکر کرتی ہوں؟

☆ میں اپنی ہی دنیا میں رہتی ہوں اور دوسروں کو نظر انداز کرتی ہوں؟
☆ میں اللہ اور اس کی مخلوق کو ان کے حقوق دینے میں غافل ہوں؟
☆ میں اپنی خواہشات کو اللہ کے احکامات پر اہمیت دیتی ہوں؟
☆ میں سمجھتی ہوں کہ میں کبھی غلط نہیں ہوسکتی؟
☆ میں ہر وقت دوسروں کی کوتاہیاں ڈھونڈتی رہتی ہوں؟
☆ میں جانتے بوجھتے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتی؟
☆ میں معافی مانگنا ضروری نہیں سمجھتی؟
☆ میں دوسروں کی تعریف کرنا پسند نہیں کرتی؟
☆ میں دوسروں کی تعریف برداشت نہیں کرتی؟
☆ میں دوسروں کی کامیابی سے پریشان ہوجاتی ہوں؟
☆ میں چاہتی ہوں کہ دوسرے میری تعریف کریں' میرے گُن گائیں' اور میری بات مانیں؟
☆ میں دوسروں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نمایاں کرتی ہوں؟
☆ دوسروں کی برائیاں اور عیب جوئیاں سن کر خوشی محسوس کرتی ہوں؟
☆ میں خود کو ناگزیر جانتی ہوں؟
☆ میں اپنی شہرت کی خواہش مند ہوں؟
☆ ہر محفل میں خود کو نمایاں کرتی ہوں اور دوسروں کی عزت نہیں کرتی؟
☆ دوسروں کی رائے پر اپنی ہی رائے کو مقدم جانتی ہوں؟
☆ دوسروں کی کمزوریوں کو تو خوب سنتی اور سناتی ہوں مگر اپنی کمزوریوں کو سننا نہیں چاہتی؟
☆ میں دوسروں کو بڑھ چڑھ کر نصیحتیں کرتی ہوں مگر خود کسی کی نصیحت برداشت نہیں کرتی؟
☆ اپنی خواہشات کی تکمیل میں خوشی محسوس کرتی ہوں؟
☆ میں اپنے کاموں کی داد لینا چاہتی ہوں؟
☆ میں کسی کا احسان نہیں مانتی؟
☆ کوئی میری مدد کرے تو اس کو اپنا حق جانتی ہوں؟
☆ سب سے اپنا حق وصول کرتی ہوں بلکہ زیادہ ہی لینا چاہتی ہوں؟
☆ میں یہ سمجھتی ہوں کہ مجھ پر کسی کا حق نہیں ہے؟

☆ بحیثیت بیٹی' بہن' بیوی' بہو' ماں الغرض ہر روپ میں میرے ارمان' شان' میری ہی ذات میرے ہی مفاد سب سے مقدم ہیں؟

☆ خدا کا حق' رسول کا حق' اللہ کے بندوں کا حق' والدین کا حق' شوہر کا حق' اولاد کا حق' استاد کا حق' ساتھیوں کا حق' پڑوسیوں کا حق' رشتے داروں کا حق' ملازمین کا حق' بڑوں کا حق' چھوٹوں کا حق ..... سب سے خود کو بچا بچا کر رکھتی ہوں اور تمام کے حقوق کے مقابلے میں مجھے بس اپنا حق ہی یاد رہتا ہے؟

اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جن کا میں جائزہ لے سکتی ہوں' احتساب کر سکتی ہوں' اپنے اندر جھانک سکتی ہوں' لیکن ..... میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا ہے اور ایک دباؤ سا سینے پر بڑھتا جا رہا ہے' سانس بھی لینا مشکل ہو رہا ہے۔ یہ جائزہ تو مجھے آئینہ دکھا رہا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ اس جھلک نے یہ شعور دیا کہ دنیا سے زیادہ آخرت کو یاد رکھیں۔ یہاں تو سب سے چھپ جائیں گے' بڑے کہلائیں گے' عالم کہلائیں گے' عابد بن جائیں گے' لیکن آخرت میں جب سب پردے کھل جائیں گے تو پھر کہاں جائیں گے؟ کیا کہلائیں گے؟ کیا کیا سزا پائیں گے؟ اللہ تعالیٰ اپنی امان میں رکھے!!

اے اللہ! میری بہترین اخلاق کی طرف رہنمائی فرما' تیرے سوا اچھے اخلاق کی راہنمائی اور کوئی نہیں دکھا سکتا' اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے' انہیں تیرے سوا مجھ سے دور اور کوئی نہیں کر سکتا۔

سبحانك اللّٰهم وبحمدك نشهد ان لا اله الا انت نستغفرك ونتوب اليك

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

ڈاکٹر اسرار احمد کی یاد میں

ریحان یوسفی

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی وفات پر جہاں دنیا بھر سے اہلِ قلم حضرات نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا وہیں وہ افراد جو دانش وری کا دعویٰ رکھتے ہیں' بھی متحرّک ہوئے اور اپنے احساسات یا درست تر الفاظ میں ''خواہشات'' کے اظہار سے باز نہ رہ سکے۔ کراچی کے ایک صاحب قلم جناب ریحان یوسفی نے بھی قلم وقرطاس کو زحمت دی اور ماہنامہ ''اشراق'' کراچی' دعوہ ایڈیشن' بابت جون ۲۰۱۰ء میں بانی محترم کی وفات پر ایک تاثراتی مضمون شائع کیا جو ایک خاص زاویۂ نگاہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مضمون میں چونکہ اسلام کے انقلابی فکر کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے لہٰذا اس کا جواب تحریر کرنا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ جواب آں غزل کے طور پر جمیل الرحمٰن عباسی صاحب نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ یوسفی صاحب کی ''خواہشات'' کس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں اور ان کا عالمِ واقعہ سے کس حد تک تعلق ہے؟ قارئین کی دلچسپی کے لیے جناب ریحان یوسفی کا مضمون اور جناب جمیل الرحمٰن عباسی کا جوابی مضمون یکجا شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

۱۴/ اپریل کی صبح میں نے اپنا موبائل فون آن کیا تو کئی میسج آئے ہوئے تھے۔ یہ میسج ایک ہی اندوہناک سانحے کی اطلاع دے رہے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے انتقال کی اطلاع۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی اطلاع میرے لیے محض ایک معروف عالمِ دین کی وفات کی اطلاع نہیں تھی' بلکہ ایک ایسی ہستی کی موت کی خبر تھی جس نے زندگی کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر میرے ذہنی اور فکری ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ میرے لیے ایک ذاتی صدمہ تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب انیسویں صدی میں مسلم دنیا کے عالمی سیاسی زوال کے بعد پیدا ہونے والی رومانوی فکری قیادت کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ رومانوی فکری قیادت کیا ہے' اس کی وضاحت مَیں بعد میں کروں گا' لیکن اس اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب کا انتقال بہت اہم ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں اُمت کی فکری رہنمائی کرنے والی قیادت کی آخری زنجیر ٹوٹ گئی اور اس طرح ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ذاتی حیثیت میں ڈاکٹر اسرار سے میرا تعلق اور امت کی فکری قیادت میں ان کی حیثیت' دونوں اعتبارات سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس ماہ کی ملاقات کو مجھے اسی موضوع کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر اسرار سے استفادے اور میری تلاش و جستجو کی داستان

ڈاکٹر اسرار سے میرے استفادے کا سلسلہ غالباً ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع ہوا تھا۔ اس کی تفصیل بتانے سے قبل یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ خود اس دور میں' میں تلاش و جستجو کی کس شدت سے گزر رہا تھا۔ اپنے متعلق یہ دراز نفسی گو کہ میرے لیے باعثِ اذیت ہے' مگر اس کے بغیر شاید قارئین پر یہ واضح نہیں ہو سکے گا کہ ایک نوجوان کے لیے ڈاکٹر اسرار احمدؒ جیسے اہلِ علم کس طرح ایک نعمتِ الٰہیہ ہوا کرتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے اپنی زندگی میں بطور مقصد اس بات کو طے کر لیا تھا کہ مذہب کے علمی مطالعے کو اپنی زندگی کا مسئلہ بنا کر یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ سچائی کیا ہے۔ میں اس بات کے لیے ذہناً تیار تھا کہ فکری اور عملی سطح پر اس کی جو قیمت مجھے دینی پڑے گی' میں دوں گا۔ میرے اس فیصلے کا ایک پس منظر تھا۔ وہ پس منظر یہ تھا کہ شعور کی عمر کو پہنچ کر میرے مطالعے اور مشاہدے نے نفسِ مذہب اور ذات باری تعالیٰ کے بارے میں متعدد سوالات پیدا کر دیے تھے۔ ان سوالات کا بنیادی سبب خدا اور مذہب کے انکار پر کھڑی وہ الحادی (atheist) فکر تھی جس سے میں کارل ساگان جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر طبیعیات اور مفکر کے ذریعے سے واقف ہوا تھا۔ وہ خود ایک ''agnostic'' تھا' یعنی حسی مشاہدات سے خدا کا براہِ راست ثبوت نہ پا کر شک و شبہ کا شکار ہو جانے والا شخص۔ یہ نقطۂ نظر مجھے کبھی متاثر نہیں کر پایا' لیکن نفس مذہب پر میرا اعتماد اہل مذہب کے باہمی اختلافات اور ان اختلافات کے حوالے سے ان کے متشددانہ رویوں کی بنا پر پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ کم عمری سے ہی مطالعے کی عادت اور مذہبی لوگوں میں گزاری ہوئی زندگی نے مجھ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اہل مذہب جن معمولی باتوں اور جس طرح کے کمزور استدلال' مبالغہ اور غلط بیانی کی بنیاد پر اپنے برسرِ حق اور دوسروں کے باطل پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' اس سے آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حق پر نہیں کھڑا ہوا۔ یہ جھوٹ اور مبالغہ کی جس چھری سے دوسروں کو حلال کرتے ہیں' ان کی اپنی گردن بھی اسی چھری کی زد میں آتی ہے۔ یہ الزام و بہتان کے جن تیروں سے دوسروں کا سینہ چھلنی کرتے ہیں' ویسے ہی تیر ان کے دشمن بھی ان کے سینے میں ترازو کر دیتے ہیں' مگر ان کو شعور نہیں ہو پاتا۔ جن قارئین کو میری یہ باتیں کچھ مبالغہ آمیز لگ رہی ہیں' وہ ذرا صبر کریں' میں آگے چل کر وہ مثالیں بھی دوں گا جن سے یہ اندازہ با آسانی ہو جائے گا کہ میں نے ایک حقیقت کا بیان کیا ہے' کوئی مبالغہ نہیں کیا۔

اسی عرصے میں مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمارے ہاں مذہب کسی فرد کے لیے ایک سچائی کی دریافت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تہذیبی روایت ہے جو ماحول اور ورثہ کی دین ہوتی ہے۔ یہاں لوگ جس چیز کو ایمان کا نام دیتے ہیں وہ درحقیقت اپنے فرقے اور نقطۂ نظر کا تعصب اور اس سے جذباتی وابستگی کا نام ہوتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی اور تعصب جس طرح ایک گروہ کے لوگوں میں اپنے نقطۂ نظر سے پایا جاتا ہے دوسرے لوگوں کے ہاں بھی ٹھیک اسی طرح اپنے نقطۂ نظر کے حوالے سے موجود ہوتا ہے۔ اس جذباتیت اور تعصب کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر اور دوسرے کی گمراہی کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے' مگر سچائی کا فیصلہ نہیں

ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب دیانت داری سے کیا جاتا ہو' مگر مجھ پر یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ یہ اگر بددیانتی نہیں تو کم ازکم بے وقوفی کی حد تک پہنچی ہوئی جذباتیت ضرور تھی۔ جبکہ خدا اور مذہب کا انکار کرنے والے بڑے مفکرین جیسے برٹنڈرسل اور کارل ساگان وغیرہ کا نقطۂ نظر اپنے استدلال کی بنیاد' تعصّبات کے بجائے علمی مسلمات اور کائناتی مشاہدات کو بناتا تھا۔ ایک دوسرے کو محض اپنے تعصّبات کی بنیاد پر گمراہ اور باطل قرار دینے والے اہل مذہب کی جذباتی اور متعصّبانہ اپروچ کے مقابلے میں ان کا نقطۂ نظر بڑی حد تک معقولیت پر استوار تھا۔ گو یہ بات مجھ پر بعد میں واضح ہوئی کہ یہ گنے چنے چند خواص کا معاملہ ہے' وگرنہ عالم ملحدین اور مذہب وخدا کا انکار کرنے والے دیگر لوگ بھی اکثر کسی عقلی اور علمی اساس پر کھڑے نہیں ہوتے بلکہ تعصب اور جذباتی اندازِ فکر ہی رکھتے ہیں۔

میری یہ خوش نصیبی یا زیادہ درست الفاظ میں ربّ کریم کی مجھ پر خصوصی عنایت تھی کہ اسی زمانہ میں میں نے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل عمر بھر میں نے قرآن کو ناظرہ پڑھا تھا یا پھر اس میں بیان کیے گئے واقعات کا تاریخی پس منظر جاننے کے لیے تفاسیر' خاص کر تفہیم القرآن سے مدد لی تھی۔ مگر قرآن کا استدلال اور پیغام مجھ پر کبھی واضح نہیں ہوسکا تھا اور تاریخی واقعات کے سوا' باترجمہ قرآن کریم کا مطالعہ' اللہ معاف فرمائے' مجھے ایک بور کر دینے والا کام لگتا تھا۔ تاہم نجانے کس طرح میں نے قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تاریخی واقعات سے کہیں زیادہ مجھے قرآن کریم کے استدلال کا بیان دلچسپ لگنے لگا۔ عرصے تک میں اس کی وجہ نہیں جان سکا' لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔ دراصل عقلی استدلال سے آشنا ہونے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ قرآن مجید کا اپنا طریقۂ استدلال بھی عین عقلی اور علمی نوعیت کا ہے۔ یہ استدلال عقل عام اور فطرت کے ایسے دلائل پر قائم ہے' جن کا انکار کرنا عقلیت کے دائرے میں رہتے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے۔ جن عقلی اور فطری مشاہدات کو لے کر خدا کا انکار کیا جاتا ہے' قرآن کریم ٹھیک انہی مشاہدات اور مسلّمات کو درست زاویے سے سامنے رکھ کر یہ بتاتا ہے کہ خدا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں مَیں نے سائنس کی تعلیم اور ڈاکٹر بننے کی خواہش کو خیرباد کہہ کر علوم اسلامی میں اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مذاہب' مسالک اور فرقوں کا مطالعہ کر کے یہ جان سکوں کہ کون قرآن مجید کے قریب کھڑا ہوا ہے۔ پہلے ہی سمسٹر میں تقابل ادیان کے کورس کی بنا پر دیگر مذاہب کے علمی مطالعے کا موقع ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان مذاہب کا معاملہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے بالکل بھی مختلف نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اگر قرآن مجید کو خود چھوڑ رکھا ہے تو غیر مسلموں کے پاس اس جیسی کتاب ہی نہیں ہے۔ اسلام کے سوا دیگر تمام الہامی و غیر الہامی مذاہب یعنی عیسائیت' یہودیت' جین مت' بدھ مت اور ہندو دھرم وغیرہ کے بنیادی عقائد ونظریات ہی اس قابل نہیں کہ عقلی تنقیدوں کی ایک مار بھی سہہ سکیں۔ یہ صرف توہمات اور خوش گمانیوں پر کھڑے ہیں اور اپنے پیدائشی مقلدّین کو ایک تہذیبی روایت اور روحانی وابستگی کا احساس دینے کے سوا کسی کام کے نہیں۔

تین سوالات

یہ سن نوے کا زمانہ تھا۔ مذاہب عالم کے مطالعے کے بعد میں نے اسلامی فرقوں اور معاصر افکار کا مطالعہ کر کے سچائی کو جاننے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں تین چیزوں میں مجھے زیادہ دلچسپی تھی اور انہی کے حوالے سے تین سوالات کا جواب مجھے ڈھونڈنا تھا۔ ایک یہ کہ مختلف فرقہ ورانہ شناختوں اور عقائد میں راہِ حق کون سی ہے۔ دوسرے فقہی مسالک میں سے کون سا مسلک رسول اللہ ﷺ سے قریب ہے۔ اور تیسرے معاصر افکار میں کون سی فکر ہے جو مقصدِ دین کو درست طور پر بیان کرتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب مجھے یہ ملا کہ فرقہ واریت اور فرقہ ورانہ سوچ کا خدا اور اس کے رسول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام اور مسلمان ہی ایک بندۂ مومن کی شناخت ہونی چاہیے۔ جس کا اس بات پر اطمینان نہیں ہے وہ تیار ہو جائے کہ قیامت کے دن اسے اللہ کے حضور یہ بتانا ہوگا کہ کیوں اللہ کی دی ہوئی شناخت اس کے لیے کافی نہیں تھی اور کیوں اسے کسی مزید فرقہ ورانہ شناخت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نیز اس خاص فرقہ کی شناخت کے ساتھ جو مزید عقائد' نظریات اور مراسم اس نے گھڑ رکھے ہوں گے' حشر کے سخت ترین ماحول میں اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسے ہر اضافی عمل' عقیدہ اور فکر کے بارے میں بتانا ہوگا کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے اسے یہ اضافہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ جو لوگ قرآن مجید سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے دن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ ایمان و عمل کے جو تقاضے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں' انسان انہی کا ٹھیک جواب دے دے' کجا یہ کہ وہ خود ساختہ عقیدوں' اعمال اور شناختوں کے بارے میں یہ بتاتا پھرے کہ انہیں کیوں ایجاد اور اختیار کیا تھا۔

فرقہ ورانہ اختلاف کے بعد دوسرا معاملہ فقہی مسالک کا تھا۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو کر سامنے آئی کہ ائمہ فقہ کسی بنیادی مسئلے میں اختلاف نہیں کرتے' بلکہ یہ فہمِ دین اور اجتہادی نوعیت کے اختلافات ہیں جو عین فطری ہیں۔ ان اختلافات سے بنیادی مسائل پیدا نہیں ہوتے' نہ ان کا نجات سے کوئی تعلق ہے۔ اس لیے اس میں انسان کا اعتماد جس امامِ فقہ کی تحقیق پر ہو اسے اختیار کر لے اور تحقیق کرنے کے قابل نہ ہو تو اپنے حالات اور ماحول میں رائج طریقے کی پیروی کر لے۔ البتہ خود کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پر سمجھنے کی روش ٹھیک نہیں ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں میری رہنمائی بنیادی طور پر دو بزرگوں نے کی جو دراصل اُمت کے دو مختلف فکری دھاروں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے ذریعے سے مجھے مسلمانوں کے معاصر افکار کو بہت گہرائی میں جا کر سمجھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک مولانا وحید الدین خاں صاحب تھے اور دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔ میں چونکہ مولانا مودودی کے افکار سے اچھی طرح واقف تھا' اس لیے شروع میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے افکار مجھے مانوس معلوم ہوئے کیونکہ ڈاکٹر اسرار دراصل انہی کے فکر کے پیروکار تھے' جبکہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے افکار سے مجھے ابتدا میں اجنبیت محسوس ہوئی مگر دو برس کے اندر ہی ان دونوں بزرگوں کے افکار کا مطالعہ میرے لیے فیصلہ کن ثابت ہو گیا۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید

توحید و آخرت اور ایمان و اخلاق کی جس دعوت کو پیش کرتا ہے' اس کی ترجمانی دراصل مولانا وحید الدین خاں صاحب کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی ہر بات بالکل ٹھیک ہوتی ہے' مگر مجموعی طور پر ان کی بات قرآن مجید سے زیادہ قریب ہے۔ جبکہ ڈاکٹر اسرار صاحب جس فکری روایت کے امین ہیں وہ بہت مقبول' میرے جذبات سے بہت قریب اور ماضی قریب کی قدر آور شخصیات کی تائید کے باوجود قرآن مجید کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد میرے لیے فیصلہ کرنا بہت آسان تھا کہ اپنا وزن کس پلڑے میں رکھنا ہے۔ میں اس حوالے سے مزید کچھ گفتگو آگے کروں گا' لیکن ضروری ہے کہ اس تحریر کا جو اصل مقصد یعنی ڈاکٹر صاحب کے علم و عمل کو جس طرح میں نے پایا' اس کی کچھ تفصیل بیان کر دوں۔

ڈاکٹر صاحب کی خصوصیات

بعض فکری معاملات میں ڈاکٹر صاحب سے اختلاف کے باوجود میں برسہا برس تک ان کے لیکچرز اور خطبات میں شریک رہا' ان کی کتابوں اور افکار کا مطالعہ کیا اور ان کے ریکارڈ شدہ آڈیو وڈیو ذخیرے سے استفادہ کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی خطابت' ذہانت اور یادداشت کے وصف سے نوازا تھا۔ مجھے ان کی تحریری صلاحیت نے گو کہ کچھ خاص متاثر نہیں کیا' لیکن بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ وہ بہت عمدہ لکھتے بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عہد کے اہم ترین اور قدیم و جدید سے واقف اہل علم و فکر سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ بھی کیا تھا۔ یوں وہ صاحبِ علم بھی تھے اور صاحبِ فکر بھی اور اپنے اس علم و فکر کو دوسروں تک پہنچانے کی غیر معمولی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

علم و ابلاغ کی ان صلاحیتوں کے علاوہ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی تین خوبیاں اس قابل ہیں کہ ان کو خاص طور پر بیان کرنا چاہیے۔ ان میں سب سے پہلی اور بنیادی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی لگا کر قرآن فہمی کو ایک تحریک بنا دیا۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ تصور رائج ہو چکا ہے کہ قرآن مجید عام لوگوں کے پڑھنے کی کتاب نہیں ہے' اسے صرف علماء کو پڑھنا چاہیے۔ اس لیے جب اس بات کو لے کر ڈاکٹر صاحب اٹھے تو ان کی بہت مخالفت بھی کی گئی' مگر وہ اپنی دعوت پر ڈٹے رہے۔ ایک طرف انہوں نے اس موضوع پر ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' جیسی اعلیٰ کتاب لکھی اور دوسری طرف اپنی غیر معمولی خطابت اور آن تھک محنت سے قرآن فہمی کا ذوق عوام تک پہنچا دیا۔ ان سے پہلے بھی بعض بڑے اہل علم کا حلقۂ درس قائم تھا اور لوگ انفرادی طور پر ان سے استفادہ بھی کرتے تھے' مگر جو مقبولیت ڈاکٹر صاحب کے حصے میں آئی وہ غیر معمولی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا جو ان کے طرز پر قرآن کریم کے فروغ کا کام کر رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دیگر طبقات حتیٰ کہ ان کے مخالفین میں سے بھی بہت سے لوگ ایسے اٹھے جنہوں نے فہمِ قرآن مجید کو ایک دعوت بنا کر معاشرے میں پھیلا دیا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاملے میں اولیت کا شرف ڈاکٹر صاحب ہی کو حاصل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی دوسری غیر معمولی چیز اپنے مشن کے ساتھ ان کی وابستگی اور اس کے لیے ہر ممکنہ قربانی ہے۔ انہوں نے جس نقطۂ نظر کو درست سمجھا اس کے لیے اپنے کیریئر کو چھوڑا' اپنی ذات

اور خاندان کو ہر طرح سے اس میں شامل کیا' اسے معاشرے میں پھیلانے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا' اپنی بات کو پوری قوت اور طاقت کے ساتھ ہر فورم اور ہر موقع پر بیان کیا اور اس معاملے میں کبھی مداہنت یا کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہیں اپنے نقطۂ نظر پر ایک نوعیت کا ایمان حاصل تھا۔ گو اس طرزِ فکر کے بعض نقائص ہوتے ہیں' مگر اس کا ایک مثبت نتیجہ ان کے لحاظ سے یہ نکلا کہ ان کی دعوت جو ابتداءً ایک شخص کی پکار تھی' ربع صدی میں ایک ادارے' ایک تنظیم اور ایک تحریک میں ڈھل گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی تیسری بڑی خصوصیت خدا کے دین کی طرف بلانے کے عمل میں ان کا جوش و جذبہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جب وہ نصرتِ دین کی صدا دیتے تھے تو ان کا جذبہ لوگوں کو ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ اس ضمن میں ایک ذاتی واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ ۹۴ء میں علومِ اسلامیہ میں آنرز کرنے کے بعد جامعہ کے بعض قوانین کی بنا پر اگلے برس علوم اسلامیہ میں ماسٹرز کرنا ممکن نہ رہا' اس لیے میں نے ماس کمیونیکیشن (صحافت) میں ماسٹرز پروگرام میں داخلہ لے لیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کراچی تشریف لائے۔ میں حسب معمول ان کے پروگرام میں شریک ہونے ان کے ادارے میں گیا۔ اس روز انہوں نے قرآن مجید اور دین کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا کہ آج جو لوگ خدمتِ دین کے لیے آتے ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیت اور توانائی نو سے پانچ بجے تک اپنی معاش کو دیتے ہیں۔ اس کے بعد شام کا وقت ہی دین کو دے پاتے ہیں۔ کیا قرآن مجید کی وقعت تمہاری نظر میں اتنی ہی ہے کہ اس کے حصے میں تمہارا بچا کھچا وقت اور نچڑی ہوئی توانائی آئے؟ کیا یہی عالم کے پروردگار کے کلام کی تمہاری نگاہ میں قدر و قیمت ہے؟ ان کے الفاظ کچھ مختلف ہوں گے' مگر مدعا یہی تھا۔ ان کے یہ الفاظ میرے دل میں اتر گئے اور میرا دل صحافت کی تعلیم سے اچاٹ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے سیاسی انقلاب کے فکر کو میں درست نہیں سمجھتا تھا' اس لیے ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کرنا ناممکن تھا' نہ فی الوقت علوم اسلامیہ میں تعلیم جاری رکھنے کا کوئی امکان تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا ایسا فضل کیا کہ اگلے ہفتے میں ماس کمیونیکیشن کی تعلیم کو خیر باد کہا اور اپنے ایک استاد سے عربی پڑھنے جانے لگا۔ اس کے بعد اگلے برس میں نے علوم اسلامی ہی میں اپنا ماسٹرز مکمل کر لیا۔

یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ میری رائے میں خدمتِ دین کے لیے اپنا معاش چھوڑنا ضروری نہیں۔ انسان معاشی جدوجہد کے ساتھ جو وقت اور پیسہ خدمتِ دین کے لیے لگائے وہی اسے اللہ کی بارگاہ میں مقبول بنانے کے لیے بہت ہے۔ تاہم مجھے اصل توجہ ڈاکٹر صاحب کی نصرتِ دین کی اس صدا کی طرف مبذول کرانی تھی جس کی تاثیر کی بنا پر متعدد نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں نے خود کو ان کے ساتھ کل وقتی یا کم از کم جز وقتی طور پر وابستہ کیا اور یہ لوگ جس نقطۂ نظر کو درست سمجھتے ہیں اب اس کے لیے زندگی لگائے ہوئے ہیں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ ایک ایسے دور میں جب پڑھے لکھے لوگ خدا اور اس کے دین کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ جز وقتی طور پر شام کے وقت ہی کیبل ٹی وی چھوڑ کر خدا کی کتاب اور اس کے دین کے مطالعے کو کچھ دے دیں' ایسے میں لوگوں کو زندگی بھر کے لیے ساتھ ملا لینے میں ڈاکٹر صاحب کی نصرتِ دین کی اس صدا کا بڑا ہاتھ ہے۔

ایک عجیب بات

بعض قارئین کو یہ بات شاید کچھ باعث حیرت لگی ہوگی کہ میں ڈاکٹر صاحب کی فکر کو درست نہیں سمجھتا اور نہ ہی میں نے ان کے ساتھ وابستہ ہونے کے بارے میں کبھی سوچا' لیکن اس کے باوجود میں برسہا برس تک ان کو پڑھتا اور سنتا رہا ہوں' یہ کیسے ممکن ہے؟ میری عاجزانہ رائے میں یہی وہ رویہ ہے جو علمی اور ایمانی طور پر درست ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا دستور یہ ہے کہ لوگوں کو جس شخص سے اختلاف ہو جائے پہلے جھوٹی اور مبالغہ انگیز باتیں کر کے اسے بدنام کرتے ہیں' اسے شیطان ثابت کرتے ہیں اور پھر اپنے پیروکاروں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ایسے دجال اور گمراہ صفت انسان کی بات سننا بھی باعث گمراہی ہے۔

قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ رویہ ہمیشہ پیغمبروں کے دشمنوں اور ہٹ دھرم کفار کا رہا ہے اور انہی کو زیب بھی دیتا ہے۔ بندۂ مومن کی شان یہ نہیں ہوتی کہ وہ سنی سنائی باتوں پر رائے قائم کرے' اسے بلا تصدیق آگے پھیلائے اور اپنے جذبات اور تعصّبات کو معیار بنا کر لوگوں کے حق و باطل کا فیصلہ کرے۔ بندۂ مومن کی شان تو وہ ہوتی ہے جسے امام شافعیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میری رائے درست ہے اور دوسروں کی غلط مگر میں یہ امکان مانتا ہوں کہ میری بات غلط ہو اور دوسروں کی رائے درست ہو۔ اس سوچ کے بعد بس اختلافِ رائے رہ جاتا ہے' کفر و نفاق اور دجالیّت کے فتوے نہیں رہتے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اس کی طرف شروع میں مَیں نے اشارہ بھی کیا تھا۔ مزید دو مثالوں سے اسے واضح کر دیتا ہوں۔ اس مضمون کی تالیف کے دوران میں ایک مذہبی رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس میں ایک بزرگ اور ''قطب الاقطاب'' سے پوچھا گیا ایک سوال نقل کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی کا کوئی دوسرا لٹریچر تو نہیں پڑھنا چاہیے' مگر مودودی صاحب نے جو تفسیر ''تفہیم القرآن'' نامی لکھی ہے وہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ جواب میں حضرت صاحب نے فرمایا کہ بیٹا! سانپوں کے بل میں ہاتھ وہ ڈالے جو (سانپ پکڑنے کا) منتر جانتا ہو۔

ایک مرشد اور ایک عالم دین کے منہ سے مولانا مودودی کے لیے سانپ اور ان کی شہرۂ آفاق تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے لیے سانپوں کے بل کی تشبیہہ نے ان کے مریدوں اور وابستگان پر جو اثر کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ دوسرا واقعہ خود ڈاکٹر اسرار سے متعلق ہے۔ ہمارے ایک دوست مفتی فیصل خورشید صاحب نے اپنا ایک واقعہ براہِ راست اس طرح سنایا کہ انہوں نے اپنے ایک استاد سے جو ممتاز عالم دین بھی ہیں' ڈاکٹر اسرار سے متعلق سوال کیا۔ انہوں نے اپنے تحریری جواب کا آغاز ہی اس جملے سے کیا کہ ''ڈاکٹر اسرار کی تحریریں پڑھنے یا تقریریں سننے کا موقع نہیں ملا''.....اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ''اتنی بات یقینی ہے کہ (تفسیر قرآن کا) کافی علم اساتذہ اور مشائخ سے حاصل نہیں کیا''۔ پھر اس بنیاد پر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے کام سے متعلق اپنی رائے دی۔ یہ بیان کرنے کی شاید کوئی ضرورت نہیں کہ وہ ایک منفی رائے تھی۔

مگر یہ بات درست نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے تفسیرِ قرآن کا علم اساتذہ اور مشائخ سے حاصل نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار باقاعدہ سند یافتہ عالم نہ سہی، مگر تفسیرِ قرآن کے لیے انہوں نے بڑے اہل علم کے مطالعے کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی جیسے غیر معمولی مفسّر قرآن، جو روایتی مدرسہ کے سند یافتہ عالم تھے، سے استفادہ کیا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں عالم صرف اپنے فرقے کا ہوا کرتا ہے، باقی سب گمراہ اور دجّال ہوتے ہیں۔ اسی لیے بڑے بڑے لوگ بھی کچھ پڑھے اور سنے بغیر باہر کے آدمی کے بارے میں اطمینان سے اپنی منفی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔

ہمارے مذہبی طبقے میں یہ کوئی استثنائی واقعات نہیں بلکہ ایک عام رویہ ہے۔ میرا ابتدائی پس منظر ایک خاص مسلک کا ہے۔ وہاں ہمیشہ یہ بتایا گیا کہ اہل حدیث اور دیوبندی دونوں گروہ انگریزوں کے ایجنٹ، گستاخِ رسول اور بد دین ہیں۔ دونوں میں بس اتنا فرق ہے کہ اہل حدیث کالے کافر ہیں اور دیوبندی گلابی کافر (یعنی منافق) ہیں۔

اسے کوئی مبالغہ نہ سمجھے، میں ذاتی علم کے علاوہ بھی ایک مثال دے دیتا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین صاحب سید احمد شہید کو کافر سمجھتے اور ہر وہابی مرد و زن سے نکاح ناجائز خیال فرماتے تھے۔

اس تربیت کے علاوہ ایک اور بات کی تلقین ہمیشہ کی جاتی رہی کہ دیگر فرقوں اور علماء کی کتابیں ہرگز نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ بد دینوں کی کتابیں پڑھنے سے انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ میری ''بدقسمتی'' کہ میں نے اپنے بزرگوں کی اس نصیحت پر عمل نہ کیا اور اب تو سب جانتے ہیں کہ میں ''گمراہ'' ہو چکا ہوں اور اس پر بہت کچھ برا بھلا سنتا رہتا ہوں: ؎

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا!

بہر حال یہ صرف ایک ہی مسلک کے اہل علم کا مسئلہ نہیں، باقی لوگ بھی ٹھیک اسی جگہ یا اس سے کچھ بدتر جگہ کھڑے ہوئے ہیں۔ تاہم مذہبی طبقے کی اس روش کا ایک نتیجہ وہ نکلتا ہے جو میرے معاملے میں نکلا کہ انسان نفسِ مذہب ہی سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا نتیجہ وہ ہے جو عام لوگوں میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کو ہر غلطی سے پاک ایک فرشتہ اور دوسروں کو شیطان اور دجال سمجھتے ہیں۔

اس طرح کے رویّے پر مجھے تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تمثیل اکثر یاد آ جاتی ہے جو انہوں نے اپنے زمانے کی مذہبی قیادت پر تنقید کرتے ہوئے بیان فرمائی تھی کہ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا (دگنا) جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ (کتاب متی ۲۳:۱۵)

بات کہیں اور نکل گئی وگرنہ ذکر خیر ہو رہا تھا ڈاکٹر اسرار صاحب کا۔ ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کی تاریخ کے ایک خاص عہد کے خاتمے کی علامت ہیں اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی اب وہ عہد ختم ہو گیا۔

میری اس بات کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے آغاز سے لے کر ماضی قریب میں دوسو برس پہلے تک دنیا پر بلا شرکت حکومت کی تھی۔ دنیا پر ان کا غلبہ صرف سیاسی نوعیت کا نہیں' بلکہ یہ غلبہ مذہبی' تہذیبی' علمی اور ثقافتی نوعیت کا بھی تھا۔ چارسو برس قبل یہ صورتحال بدلنا شروع ہوئی اور دوسو برس کے اندر یورپی اقوام نے دنیا بھر کو مفتوح کرلیا۔ دنیا کے سابقہ حکمران یعنی مسلمان اب ان یورپی قوموں کے غلام تھے اور وہ ان کے آقا۔ یہ صورتحال حساس دلوں پر جو قیامت ڈھا رہی تھی اس کا کوئی اندازہ آج کل کے لوگ کر ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ اس غلبے کے خلاف کچھ تو سیاسی مزاحمت ہوئی جسے علمی اور فوجی اعتبار سے برتر یورپی اقوام نے کچل دیا۔ دوسری مزاحمت فکری محاذ پر ہوئی جو دلوں میں اپنی جگہ بناتی چلی گئی۔ یہ مزاحمتی سوچ ایک رومانوی سوچ بھی تھی۔ یعنی دنیا بھر کے مسلمان ایک بار پھر متحد ہو کر دوبارہ خلافت اسلامی کا احیا کریں جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی ایک علامت تھی۔ اس وقت تاریخ دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اس فکر کو مسلمانوں کی عالمی فکر کے قالب میں سید جلال الدین افغانی نے ڈھالا۔ علامہ اقبال نے اسے مسلمانوں کے فخر اور امامت عالم کی خواہش میں بدلا' مولانا مودودی نے اسے مذہبی اور علمی اساسات فراہم کر کے اسے باقاعدہ ایک تحریک بنایا اور ہمارے ممدوح ڈاکٹر اسرار صاحب اس کے نقیب بن کر چالیس برس تک ڈٹے رہے۔ مجھے اس فکر کی مذہبی اساسات سے اختلاف ہے اور میں اسے تہہ در تہہ غلط فہمیوں پر مشتمل سمجھتا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت نہ کسی علمی بحث کا موقع ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ بات یہ بیان کرنی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ مسلمانوں کے اس رومانوی سیاسی فکر کا آخری بڑا آدمی رخصت ہو گیا۔ ایک ایسا آدمی جو اپنی خداداد ذہانت' شعلہ بیاں خطابت اور ان تھک جدوجہد کی بنیاد پر اس فکر کو پھیلانے اور منوانے کی جدوجہد کرتا رہا' لیکن پچھلے پچاس برسوں میں اس نقطۂ نظر پر اتنی اعلیٰ علمی اور فکری تنقیدیں سامنے آچکی ہیں کہ اس کے بعد کوئی معقول (جذباتی لوگوں کا تو خیر کچھ نہیں ہوسکتا) شخص جو تحلیل و تجزیہ کرنے کی کچھ صلاحیت رکھتا ہو اس نقطۂ نظر کا قائل نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ مان نہیں سکتا کہ قرآن کو نازل کرنے والے اور نبی آخر الزماں ﷺ کو بھیجنے والے پروردگار کو اس سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین دنیا پر بالجبر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم کرنا مقرر کردے۔ قرآن کریم میں کوئی ایک آیت بھی نہیں جو اس بات کو بیان کرتی ہو۔ اس کے برعکس قرآن مجید واضح طور پر فرد کی زندگی کا نصب العین یہ بتاتا ہے کہ آخرت کی کامیابی کا معیار دنیا میں اپنے نفس کو پاکیزہ کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے جینا ہے (اعلیٰ ۸۸:۱۴' شمس ۹۱:۹) تزکیۂ نفس کے اسی مقصد کے حصول کے لیے رسول کریم ﷺ کو اہل ایمان کے اندر بھیجا گیا (جمعہ ۶۲:۲) پورا قرآن ایمان و اخلاق کی اس تعلیم سے بھرا ہوا ہے جو انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی' حیوانی اور نفسیاتی وجود کا تزکیہ کرتی ہے۔

بہرحال اختلاف اتفاق اپنی جگہ مگر اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس چیز کو دیانت داری سے صحیح سمجھا اس کے لیے اپنی زندگی لگادی۔ یہ ان کے اخلاص کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے

امید اور دعا ہے کہ وہ ان غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کر کے ان کے اخلاص اور تقویٰ کی بنیاد پر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار کے انتقال کے ساتھ سیاسی انقلابی فکر کا آخری داعی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا کام اس اعتبار سے غنیمت تھا کہ وہ انقلاب کے لیے پُرامن مزاحمت یا passive resistance کے قائل تھے۔ بقول ان کے اگر انہیں دو لاکھ لوگ مل جائیں تو وہ پرامن احتجاج اور یک طرفہ طور پر گولیاں کھاتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کر کے اسلام نافذ کریں گے۔ انتہائی بدقسمتی کہ ان کے بعد اب اس فکر کے پاس زیادہ تر تکفیری ذہن کے وہ لوگ رہ گئے ہیں' جو ہر اختلاف کرنے والے کو کافر قرار دے کر اس کا قتل جائز قرار دیتے' دہشت گردی کی فصل کی آبیاری کرتے اور معصوم مسلمانوں اور علمائے دین کے قتل جیسے سنگین جرائم کو سند جواز عطا کرتے ہیں۔ ایمان و اخلاق کے اعتبار سے ایک پست قوم میں دعوت و اصلاح کا کام کرنے کے بجائے سیاسی اقتدار کے پیچھے انتہا پسندی اختیار کرنے کی یہی وہ روش ہے جسے یہودیوں نے اختیار کیا تھا۔ وہ اس روش کے ایسے دیوانے ہوئے کہ سمجھانے والے نبیوں کے قتل کے درپے ہو گئے' جس کے بعد اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب ان پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے بخت نصر اور پھر ٹائٹس رومی کے ہاتھوں انہیں بدترین تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنے قہر اور ناراضی سے محفوظ فرمائے۔

ایک نئے دور کا آغاز

میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ امید رکھتا ہوں کہ ہمارے ساتھ یہ نہیں ہوگا۔ جو ہوگا وہ یہ کہ اسلام کا پیغام دنیا بھر میں پھیل جائے گا۔ ایمان و اخلاق کی دعوت ہر انسان تک جا پہنچے گی۔ میں اس پر پہلے بھی کئی دفعہ گفتگو کر کے بتا چکا ہوں کہ ختم نبوت کے بعد توحید کی یہ جنگ اللہ تعالیٰ خود لڑ رہے ہیں۔ وہ مسلسل اس کے لیے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ وہ دعوتِ دین کے ہر کام کو فروغ دے رہے ہیں اور سیاسی انقلابی فکر ہر میدان میں پیچھے ہٹ رہی ہے۔ آپ اسی بات کو دیکھ لیجیے کہ جو سب سے زیادہ معروف اور باصلاحیت آدمی ڈاکٹر اسرار سے متاثر ہوا وہ ہندوستان کے ڈاکٹر ذاکر نائیک ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر اسرار کی فکر کے مطابق ہندوستان میں کوئی سیاسی انقلاب برپا کرنے کے بجائے دیگر مذاہب پر اسلام کی برتری کے بیان کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ سیاسی رومانوی دور کے خاتمے کے بعد اُمت کی ساری فکر ی قیادت تیزی سے ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے جن کا میدانِ تحقیق علم اور دعوت ہے۔ اب زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ یہ جنگ جو اللہ تعالیٰ کی اپنی جنگ ہے' اس میں وہ غالب آ جائیں گے۔ توحید کا پیغام ہر دل کا دروازہ کھٹکھٹا رہا اور ذہن کے دریچے پر دستک دے رہا ہوگا۔ اس کے بعد یا تو لوگ خداوند کائنات کے سامنے سربسجود ہو جائیں گے یا پھر خدا اسرافیل کو حکم دے گا' قیامت کا صور پھونکا جائے اور زمین اپنے رب کے نورِ توحید سے روشن ہو جائے گی۔

جواب آں غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی.....

جمیل الرحمٰن عباسی

حال ہی میں ریحان یوسفی صاحب کی ایک تحریر بعنوان ''ڈاکٹر اسرار احمد کی یاد میں'' نظر سے گزری اور ہم جیسے بہت سوں کو محظوظ کر گئی۔ لیکن اس حظ میں اسف کا مزاج اور یاس کی ختام بھی ہے۔ حظ کا تعلق تو ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی شخصی خوبیوں کے بیان سے ہے اور اسف و یاس کا سبب اسلامی انقلابی فکر کے بارے میں موصوف کے خیالات ہیں۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی مدح و توصیف کے بیان کا تعلق ہے تو ہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ یوسفی صاحب کی وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا مظہر ہے۔ باوجود اس کے ہم کچھ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ شاید یہ بیانِ مدح موصوف کے فکری ''ارتقاء'' اور ان کے شیخ جناب وحید الدین خان کے فکر کے ''تنزل'' کا مرہون ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے اسلام کے انقلابی فکر کو رد کرتے ہوئے صرف تزکیۂ نفوس و اخلاق ہی کو قرآن کا نکتۂ وحید قرار دیا اور اپنی توجہات کا مرکز اور نگاہوں کا منصب صرف کردار و اخلاق ہی کو بنالیا اور اس کیفیت میں انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کی طرف نگاہ اٹھائی تو ﴿فَلَمَّا رَاَیْنٰهُ اَكْبَرْنَهٗ﴾ (یوسف: ۳۱) کے مصداق انہوں نے ڈاکٹر اسرار کی شخصی خوبیوں ہی کو بڑا جانا' جبکہ ہماری نظر میں ڈاکٹر صاحب کے شخصی کردار اور خوبیوں کے باوصف ان کی اصل اہمیت اسلامی انقلابی فکر کے تحمل و تحمیل ہی کے بدولت ہے' ورنہ شخصی خوبیوں اور تقویٰ و تدین میں کئی علماء و مشائخ ان سے بڑھے ہوئے بھی ہوں گے۔

اسلام کے انقلابی فکر (جس کو موصوف رومانوی قرار دیتے ہیں) کے بارے میں ان کا تردّد غیر ارادی طور پر ہی سہی یوسفی صاحب کی سوچ میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اس مختصر مقالے میں باختلافِ الفاظ چھ مرتبہ اس بات کا اظہار کیا کہ اسلام کی سیاسی ''رومانوی'' فکر کا دور ختم ہو گیا۔ انہوں نے اس بات کو کس طرح تکرارِ لفظی کے ذریعہ حقیقت باور کروانے کی کوشش کی' ذرا ملاحظہ فرمائیے!

(۱) ''ڈاکٹر صاحب انیسویں صدی میں مسلم دنیا کے عالمی سیاسی زوال کے بعد پیدا ہونے والی ''رومانوی'' فکری قیادت کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔'' (ص ۳۴' اشراق دعوہ ایڈیشن کراچی' جون ۲۰۱۰ء)

(۲) ''اور اس طرح ایک دَور کا خاتمہ ہو گیا۔'' (ص ۳۴)

(۳) ''وہ ایک خاص عہد کے خاتمے کی علامت ہیں۔'' (ص ۴۴)

(۴) ''ان کے انتقال کے ساتھ ہی اب وہ عہد ختم ہوگیا۔''(ص۴۴)

(۵) ''مسلمانوں کے اس ''رومانوی'' سیاسی فکر کا آخری بڑا آدمی رخصت ہوگیا۔''(ص۴۵)

(۶) ''ڈاکٹر اسرار کے انتقال کے ساتھ سیاسی انقلابی فکر کا آخری داعی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔''(ص۴۵)

ہمارے نزدیک موصوف کا یہ اعادہ وتکرار نری ''رومانویت'' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ''اُمنیت'' پر مشتمل ہے کہ— ''دور ختم ہوگیا!!'' ہم کہتے ہیں کہ دور آنے والا ہے اور ہم اپنے ''غریبوں'' کو خوشخبری سنانا چاہتے ہیں کہ ہم گویا ''صلصلة الجرس'' اپنے کانوں سے سن رہے ہیں کہ کہنے والا کہہ رہا ہے:

((بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(۱)

چاہیے کہ ''غرباء'' ان باتوں سے دل چھوٹا نہ کریں' اسلام سے چمٹے رہیں' خوشخبری مل کے رہے گی۔ کیا خوب فرمایا باری تعالیٰ نے: ﴿طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ۝۲۹﴾ (الرعد) خود موصوف کے الفاظ میں حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی دعوت کی صورت حال کچھ یوں ہے:

''ان کی دعوت جو ابتداءً ایک تنہا شخص کی پکار تھی ربع صدی میں ایک ادارے' ایک تنظیم اور ایک تحریک میں ڈھل گئی۔'' (ص۴۰' اشراق دعوۃ ایڈیشن کراچی)

گویا اسلامی انقلابی فکر کا گراف اوپر ہی جا رہا ہے۔ ع ''یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں'' کے مصداق بات فردِ واحد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ ایک منظّم تنظیم اپنے کئی ذیلی اداروں اور اپنے ہزاروں جاں نثاروں کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ اصحابِ فکر انقلاب اگرچہ خطاب و بیان میں ڈاکٹر صاحبؒ کی گردِ راہ کو بھی نہیں پہنچتے لیکن اس مشن کے ساتھ خلوص ولگن اور جذباتی وعقلی تعلق میں ڈاکٹر صاحب سے ہرگز کم نہیں اور ان شاء اللہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں کہ ع ''جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر؟'' بات یقیناً فردِ واحد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ ع ''بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے!'' سو آپ بھی دیکھا کیجیے اور ہم بھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم علامہ اقبال کی ایک نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں انہوں نے اسلام کے ''ہمہ گیر'' غلبہ کی نوید سنائی ہے ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

اقبال کے اشعار تو ہم نے ذوقِ اصحابِ سخن کی تسکین کی خاطر نقل کیے ہیں ورنہ ہمارا مدارِ ایمان تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان ہیں! اس ضمن میں مندرجہ ذیل دو احادیث ملاحظہ کیجیے:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا)) (۱)

''بے شک اللہ نے میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا اور میں نے اس کے تمام مشرق اور مغرب دیکھ لیے' اور یقیناً میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوگی جو مجھے سکیڑ کر دکھائے گئے۔''

اور:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِیْلٍ (۲)

''زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ گارے کا گھر بچے گا اور نہ کوئی اونٹ کے بالوں کا خیمہ مگر اللہ اس میں کلمہ اسلام کو داخل کرے گا' کسی عزت والے کو عزت دے کر یا کسی ذلیل کو ذلیل کر کے۔''

موصوف کا یہ بھی فرمانا ہے کہ اس فکر پر پچھلے سالوں میں اتنی اعلیٰ علمی اور فکری تنقیدیں سامنے آچکی ہیں کہ اس کے بعد کوئی معقول شخص اس نقطۂ نظر کا قائل نہیں ہوسکتا۔ ہم اس فقرے کو ان کی سادہ لوحی پر محمول کرتے ہوئے انہیں کوئی دوش نہیں دینا چاہتے۔ موصوف کے نزدیک اس ''رومانوی'' فکر کو مذہبی اور علمی اساسات فراہم کرنے والے مردِ قلندر سید مودودیؒ نے غالباً آج سے ۶۳ سال پہلے کسی خاص کیفیت میں کہا تھا:

''ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا اور سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیو یارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی۔''
(مارچ ۱۹۴۷ء بحوالہ ترجمان القرآن)

اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی پہلی بات پوری ہو چکی' دوسری ہونے کو ہے۔

موصوف اسلام کے انقلابی فکر کے بارے میں اپنی سوچ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''یہ مزاحمتی سوچ ایک رومانوی سوچ بھی تھی' یعنی دنیا بھر کے مسلمان ایک بار پھر متحد ہو کر دوبارہ خلافت اسلامی کا احیا کریں جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی ایک علامت تھی''۔ لفظ رومان انگریزی سے درآیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (i) فرضی داستان کے لیے (ii) حیرت انگیز چیز

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعة' باب هلاك هذه الامة بعضهم ببعض۔
(۲) مسند احمد' باقی مسند الانصار' حدیث المقداد بن اسود ؓ۔

کے لیے اور(iii) عشق ومحبت کے لیے۔اگر یوسفی صاحب کی مراد دوسرے معنی ہیں تو بھی سر آنکھوں پر' کیونکہ کسی چیز کا حیرت انگیز ہونا اس کے عدم یا ناممکن الوقوع ہونے کو مستلزم نہیں۔اور اگر انہوں نے تیسرے معنی مراد لیے ہیں یعنی عشق ومحبت تب تو انہوں نے حق کہا کہ خود حق تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس مشن کے لیے نقد جان نذر کرنے کو صف در صف حاضر ہو جاتے ہیں:﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾(الصّف) یاد رہے اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر اس مشن کا ذکر نبی آخر الزماں ﷺ کے مقصدِ بعثت کے ضمن میں ان الفاظ کے تحت آیا ہے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبہ:۳۳' الصّف:۹) تو اس اعتبار سے ہم رومانوی ہونے پر ہرگز شرمندہ نہیں۔رہا پہلا معنی یعنی فرضی داستان تو خدا نہ کرے ان کا مطلب یہ ہو' جبکہ خود انہوں نے ''دوبارہ خلافت اسلامی کا احیاء'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ہم نہیں سمجھ سکتے جو ادارہ خود ان کے الفاظ میں ماضی قریب میں دوسو برس پہلے تک قائم رہ چکا ہو وہ کیسے رومانوی یا فرضی داستان بن سکتا ہے؟ اور احیائے ثانی اگر رومانوی سوچ ہے تو تشکیلِ اوّل تو اس سے بڑھ کر رومانوی کہلانی چاہیے—— اور احیائے ثانی کے قائلین کو اگر رومان پرست قرار دیا جائے تو قرنِ اوّل کے قائلین کو کیا کہا جا سکے گا؟؟ سوچنا چاہیے کہ اس اندازِ فکر کی زد کہاں پڑتی ہے؟

موصوف کو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اُمتِ محمدیہ ﷺ پر عذاب نہ آئے گا بلکہ اسلام کا پیغام دنیا بھر میں پھیل جائے گا اور ایمان واخلاق کی دعوت ہر انسان تک جا پہنچے گی۔ہم بھی دعا گو ہیں اللہ ہمیں عذاب سے بچائے۔ہم موصوف سے اس حد تک تو متفق ہیں کہ اسلام لوگوں کو مسخر کر لے گا' البتہ یہ اضافہ کرنا چاہیں گے کہ ایسا اسلام سیاسی غلبہ کے بغیر ممکن نہیں۔اس کی ایک دلیل تو یہ بھی ہے کہ قرنِ اوّل میں ایسا ہی ہوا تھا' کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ توحید کی وضاحت اور اس کا مدلل اثبات نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا اور جب وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود تمام افراد کو مسلمان نہ کر سکے تو کوئی اور کیسے کر سکے گا؟ فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد کم وبیش دس ہزار تھی اور حجۃ الوداع پر تعداد سوا لاکھ تک جا پہنچی۔آخر ان دوسالوں میں نبی اکرم ﷺ نے کتنے مقالے لکھے؟ کتنے ٹاک شوز منعقد کیے؟ کتنے رسالے جاری کیے؟ کتنے دعوتی وفد روانہ کیے جو قریہ قریہ جا کے توحید کی دعوت پیش کرتے؟ یا پھر شاید نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو کچھ خصوصی معجزے دکھائے ہوں! آخر یہ کیسے ہوا کہ توحید کی یہ جنگ جو کم از کم اُس وقت تو نبی اکرم ﷺ خود لڑ رہے تھے (کیونکہ بمطابق الفاظ یوسفی ختم نبوت کے بعد توحید کی یہ جنگ اللہ تعالیٰ ''خود'' لڑ رہا ہے) مسلمانوں کے ہاتھ رہی! ہمیں جو سمجھ آتا ہے وہ یہی ہے جو قرآن کو نازل کرنے والے اور نبی آخر الزماں ﷺ کو بھیجنے والے پروردگار نے قرآن حکیم میں بیان کیا ہے کہ ''جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی اور آپ ﷺ نے لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیا''۔لفظ فتح اپنے مفہوم میں بالکل واضح اور کسی وضاحت سے مستغنی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اسلام کو فروغ سیاسی غلبے کے بعد ہی حاصل ہوا۔ایران وعراق کے مسلمانوں سے پوچھ لو یا پھر فارس وروم کی تاریخ سے دیکھ لو۔دونوں گواہی

دیں گے کہ اس خطۂ زمین میں فرزندانِ توحید کی یہ آبادکاری کسی مبلغ وداعی کے سوزِ بیان کے سبب نہیں بلکہ سیفُ اللّٰہ اور اَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃ ﷺ کی مجاہدانہ ترکتازیوں ہی کے طفیل ہے اور زمانِ آخریں میں اسلام کا غلبہ جو احادیث صحیحہ سے پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے اور جس کی طرف فاضل مقالہ نگار نے الفاظ درج ذیل کی رو سے اشارہ کیا ہے—صریحاً اقرار کے بجائے ایسے الفاظ استعمال کرنے میں جن کی دلالت ایک طرف بھی راجح نہیں' نہ معلوم کیا حکمت ہے! اگرچہ ہم یہی گمان کرتے ہیں کہ وہ اس غلبہ کے قائل ہیں۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

''توحید کا پیغام ہر دل کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوگا اور ہر ذہن کے دریچے پر دستک دے رہا ہوگا۔ اس کے بعد یا تو لوگ خداوند کائنات کے سامنے سربسجود ہو جائیں گے یا پھر خدا اسرافیل کو حکم دے گا' قیامت کا صور پھونکا جائے گا اور زمین اپنے ربّ کے نورِ توحید سے روشن ہو جائے گی۔''

اس معصوم سے فقرے میں جس میں جنگ وخوں کا نام تک نہیں' لفظ ''یا'' کا دہرا استعمال ہمارے لیے حیرت ناک ہے۔

بہرحال کہنا یہ مطلوب ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ سیاسی غلبے ہی کی صورت نمودار ہوگا' عالمی اسلامی خلافت قائم ہوگی اور ان غیر مسلموں کو ذمّی بن کر رہنا پڑے گا جو اسلام قبول نہ کریں گے۔ اس کی دلیل وہ حدیث مبارکہ ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں۔ اس حدیث کے یہ الفاظ قابل غور ہیں: ''بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِیْل'' یعنی اسلام کے ہر گھر میں داخلے کی دو صورتیں بیان فرما دیں' ایک تو یہ کہ لوگ اسلام کو بطور دین اختیار کر لیں یعنی مسلمان ہو جائیں' اور جو یہ نہ کریں تو انہیں جزیہ دے کر اسلام کو ملک کی بالاتر سیاسی قوت مانتے ہوئے اس کے ماتحت رہنا ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں کہیے تو بات یوں بنے گی: ﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبہ) ''یہاں تک کہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں''۔ مندرجہ بالا الفاظ سے کوئی دوسرا مطلب نکالنا ممکن ہی نہیں۔ یہ مفہوم خود احادیث میں وارد ہوا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: ((اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا اَوْ یُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا))(۱) یعنی اللہ یا تو ان لوگوں کو عزت عطا کرے گا کہ انہیں اسلام کے اہل یعنی مسلمانوں میں شامل کر دے گا یا ان کو ذلیل کر دے گا پس وہ اسلام کی تابعداری اختیار کر لیں گے۔ دوسری روایت میں راوی صحابی تمیم داری رضی اللہ عنہ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَقَدْ اَصَابَ مَنْ اَسْلَمَ مِنْھُمُ الْخَیْرُ وَالشَّرْفُ وَالْعِزُّ وَلَقَدْ اَصَابَ مَنْ کَانَ مِنْھُمْ کَافِرًا الذُّلُّ وَالصَّغَارُ وَالْجِزْیَۃُ (۲)

''لوگوں میں سے جو ایمان قبول کر لے گا اس کے لیے خیر' عزت اور شرف ہے' اور جو کافر رہا

---

(۱) مسند احمد' باقی مسند الانصار' حدیث المقداد بن اسود رضی اللہ عنہ۔

(۲) مسند احمد' مسند الشامیین' حدیث تمیم الداری رضی اللہ عنہ۔

اس کے لیے ذلت' چھوٹے بن کر رہنا اور جزیہ ادا کرنا ہے۔''

بات دُور نکل گئی حالانکہ موصوف کے بقول اس وقت نہ کسی علمی بحث کا موقع ہے نہ ضرورت۔ ہمیں فاضل مقالہ نگار کے فکر سے نہ صرف اختلاف ہے بلکہ ہم اسے تہہ در تہہ مغالطوں پر مشتمل سمجھتے ہیں اور ایسا ہم بر بنائے الفاظِ آمدہ سمجھنے پر مجبور ہیں:

''کوئی معقول شخص (جذباتی لوگوں کا تو خیر کچھ نہیں ہوسکتا) جو تحلیل و تجزیہ کرنے کی کچھ صلاحیت رکھتا ہو وہ یہ نہیں مان سکتا کہ قرآن کو نازل کرنے والے اور نبی آخر الزماں ﷺ کو بھیجنے والے پروردگار کو اس سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین دنیا پر بالجبر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم کرنا مقرر کردے۔'' (ص ۴۵' اشراق دعوۃ ایڈیشن)

ہم کہتے ہیں کوئی صاحب عقل یہ نہیں مان سکتا کہ قرآن کو نازل کرنے والے اور رسول ﷺ کو مبعوث کرنے والے پروردگار کو دنیا میں مسلمانوں کے سیاسی غلبہ سے کوئی دلچسپی نہ ہو (چاہے بالجبر ہی سہی)! آخر ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ جہاں تک ''نصب العین'' کا تعلق ہے' اس رائے میں ہم جناب کے ساتھ متفق ہیں بلکہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے کہ ہم جہاد و قتال اور سیاسی غلبہ تو دور کی بات تزکیۂ نفس اور نماز روزہ کو بھی کسی مؤمن کا نصب العین نہیں سمجھتے۔ ہماری نظر میں نصب العین تو وہ منزلِ مراد ہے جس کی طرف قرآن پکارتا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (آل عمران: ۱۳۳)

چنانچہ قرآن کے نزدیک مؤمن کا نصب العین اللہ کی مغفرت اور جنت کا حصول ہی ہے' اور جو لوگ حور و قصور کے معاملے میں غضِّ بصر سے کام لے سکتے ہوں تو ان کا اصل نصب العین حد ادراک سے پرے واقع ہے اور وہ ہے رضائے رب جو جنّات و اَنہار سے بڑھ کر ہے۔ سورۃ التوبہ' (آیت ۷۲) میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ اور ﴿وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ کی خوشخبریاں سنانے کے بعد فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾۔

پس ہماری نظر میں دین کے تمام احکام اسی نصب العین کے حصول کے ذرائع ہیں اور ان ذرائع میں کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ موصوف نے تزکیۂ نفس کے ثبوت کے طور پر دو آیات کا حوالہ دیا۔ ہم بحمداللہ ان پر ایمان رکھتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ ہم تزکیۂ نفس کو حقیقی نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں' لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قرآن حکیم میں (ہمارے محتاط اندازے اور محدود مطالعہ کی حد تک) کم از کم سات دفعہ جہاد کا حکم' اَن گنت مقامات پر مجاہدین کے فضائل و ثواب اور جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی شدید مذمت و عتاب کیوں یوسفی صاحب کی نظر میں اتنی بھی توجّہ نہ پاسکا کہ کسی بھی درجہ میں نصب العین قرار دیا جاسکتا؟ جبکہ کئی مقامات پر تو جہاد کو اُخروی نجات کے لیے لازم اور کئی مقامات پر ایمان کا ثبوت بھی قرار دیا گیا۔ قرآن و حدیث کے بکثرت دلائل اس پر شاہد ہیں اور حق بات یہ ہے کہ یہ دونوں

اقسام رضائے رب اور نجات اخروی کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ موصوف کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جو سیاسی غلبے کو ایک مسلمان کا نصب العین بتاتی ہو۔ اگر نصب العین کا تصور وہ ہے جو ہم نے واضح کیا تو ہمیں ان سے اتفاق ہے' لیکن اگر کوئی اس سے یہ مطلب نکالے کہ قرآن سیاسی غلبہ کی ترغیب اور حکم نہیں دیتا تو یہ نقصِ فہم کی علامت ہے' جس کا علاج ضروری ہے۔

بلاشبہ قرآن بغیر کسی لگی لپٹی کے سیاسی غلبے کی بات کرتا ہے' اس کی نمایاں ترین مثال سورۃ التوبہ کی آیت ۲۹ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کا منتہائے مقصود یہ بتایا ہے: ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ ''یہاں تک کہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے ہو کر رہیں''۔ ظاہر ہے جزیہ کا نظام خالصتاً ایک سیاسی معاملہ ہے نہ کہ مذہبی' اور ویسے بھی کسی شخص کا عقیدہ بالجبر بدلنا تو اسلام میں روا ہی نہیں' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''دین میں کوئی زبردستی نہیں''۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسری طرف یہی قرآن کہتا ہے: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۹۳) دوسری جگہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)۔ ان آیات میں قتال کی دو غایات بیان ہوئی ہیں: انسدادِ فتنہ اور دین کا کل کا کل اللہ کے لیے ہو جانا۔ فتنہ سے مراد وہ قوتیں ہیں جو اسلام کی تبلیغ کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہوں جبکہ ''يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' سے سیاسی غلبہ مراد ہے۔ ہم کسی ''رومانوی'' مفکر کی رائے نہیں دینا چاہتے بلکہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے لکھتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان نصوص سے سیاسی غلبہ کا مطلب ''رومانوی'' لوگوں نے ہی نہیں بلکہ قدامت پسند اور روایتی علماء نے بھی لیا ہے۔ مولانا رقمطراز ہیں: ''یہ جہاد کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے' حکم اکیلے خدا ہی کا چلے' دینِ حق سب ادیان پر غالب آ جائے' خواہ دوسرے ادیان کی موجودگی میں جیسے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں ہوا یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے جیسے نزولِ مسیح کے وقت ہوگا (تفسیر عثمانی' حاشیہ آیہ ۳۹' سورۃ الانفال) اور یہ بات معلوم ومعروف ہے کہ خلافتِ راشدہ کی شان اسلام کا سیاسی غلبہ ہی تھی۔

یوسفی صاحب ایک بہت دلچسپ بات لکھتے ہیں کہ ''ختمِ نبوت کے بعد توحید کی یہ جنگ اللہ خود لڑ رہا ہے''۔ اس اعلانِ یوسفی سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ ختمِ نبوت سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام تنہا یہ جنگ لڑ رہے تھے اور ختمِ نبوت کے بعد اللہ نے وہ تمام کام خود کرنے شروع کر دیے جو نبی کیا کرتے تھے' مثلاً دعوت وتبلیغ اور بحث وجدال۔

ظاہر ہے ان دونوں مطالب کی غلطی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت واقامت کا کام اپنے بندوں سے ہی لیتے ہیں اور ایسا اللہ تعالیٰ کی کسی کمزوری کے سبب نہیں بلکہ حکمت کے تحت ہوتا ہے اور وہ حکمت سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے آخر میں بیان ہوئی ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ ''تاکہ اللہ ظاہر کر دے کون ہے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد

کرتا ہے باوجود غیب میں ہونے کے۔ بے شک اللہ قوت والا اور غالب ہے''۔ یعنی اللہ قوی اور عزیز ہے' وہ آنِ واحد میں دین کو غالب اور کفر کو مغلوب کر سکتا ہے لیکن اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے اس نے یہ کام ان کے ذمّہ لگا دیے۔ ختم نبوّت سے پہلے بھی یہ جنگ حقیقتاً اللہ ہی لڑ رہا تھا کیونکہ فاعلِ حقیقی وہی ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال:۱۷) اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے فاعلِ حقیقی کا کردار ادا کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے' البتہ نبی ﷺ کے بعد فاعلِ مجازی کی حیثیت اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے' اب کارِ رسالت اس کے ذمہ ہے۔ چنانچہ فرمانِ باری ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) اور ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)۔ موصوف یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''اسلام کی انقلابی فکر ہر میدان میں پیچھے ہٹ رہی ہے''۔ ہم کہتے ہیں اسلامی انقلابی فکر کو تیزی سے پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ مستقبل اسی فکر کا ہے اور فتح بھی' حتیٰ کہ روایتی علمائے کرام میں بھی غلبہ و اقامتِ دین کی سوچ اور انقلابی فکر پھیل رہی ہے۔ ہماری مراد غلبہ و اقامت دین کی وہ تحریکات ہیں جن کے اغراض و مقاصد اور طریق کار میں انقلابی طرز کی جدوجہد کے ذریعے نظام خلافت کا قیام ہے۔ نیز' وہ لٹریچر بھی نہایت اہم ہے جو اسلام کے ہمہ گیر سیاسی و معاشرتی غلبہ کے ضمن میں روایتی علماء کے طبقے میں وجود میں آ رہا ہے۔[1]

اگرچہ یہ محض ابتدا ہے' اس تحریک اور فروغِ فکرِ اسلامی کو ایک لمبا سفر طے کرنا ہے' لیکن اتنی پیش رفت بھی اس دعوے کے ابطال کے لیے کافی ہے کہ اسلامی انقلابی فکر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بعد اس فکر کے پاس زیادہ تر تکفیری ذہن کے لوگ رہ گئے ہیں۔ اس تبصرے پر جو سب سے بامروّت اور نرم تبصرہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔ اس انقلابی فکر کی حامل جماعتوں میں جماعتِ اسلامی اور تنظیمِ اسلامی اہم ترین ہیں اور جن خامیوں کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے ہم نہیں سمجھتے کہ ان جماعتوں میں یہ کہیں نظر آتی ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''ایمان و اخلاق کے اعتبار سے ایک پست قوم میں دعوت و اصلاح کا کام کرنے کے بجائے سیاسی اقتدار کے پیچھے انتہا پسندی اختیار کرنے کی یہی وہ روش ہے جسے یہودیوں نے اختیار کیا اور وہ اس روش کے ایسے دیوانے ہوئے کہ سمجھانے والے نبیوں کے قتل کے درپے ہو گئے' جس کے بعد اللہ کا قہر و غضب ان پر ٹوٹ پڑا۔''

مقامِ شکر ہے کہ اس حد تک ہم متفق ہیں کہ یہود نے رسولوں کی نافرمانی کی بلکہ ان کے قید و قتل سے بھی گریز نہ کیا اور اس کے نتیجے میں ان پر زمینی اور آسمانی عذاب آتے رہے' لیکن مقامِ فکر یہ ہے کہ وجۂ عذاب میں ہم نہ صرف ان سے اختلاف بلکہ ایک ''انتہا پسندانہ'' رائے رکھتے ہیں۔ موصوف کے

---

(۱) اس کے ثبوت کے لیے ملاحظہ کیجیے مولانا زاہد اقبال صاحب کی کتاب ''اسلامی نظامِ خلافت اور ہماری ذمّہ داری'' شائع کردہ: ادارہ نشریات محمود حسن' لاہور۔

نزدیک وجہِ عذاب یہ تھی کہ یہود سیاسی غلبے کے پیچھے انتہا پسندی اختیار کیے ہوئے تھے جبکہ رسول ان کو روکتے تھے اور باز نہ آنے پر ان کو عذاب دیا جاتا رہا۔ ہمارے نزدیک رسول ان کو دین پر انفرادی و اجتماعی زندگی میں عمل کرنے کا حکم دیتے تھے اور اس کے لیے جہاد نہ کرنے کے سبب ان کو سزا دی جاتی رہی۔

آیئے قرآن کی روشنی میں اس دعوے کی حقیقت دیکھیں۔ یہود کی سیاسی آزادی کی تحریک تو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شروع کی، جب فرعون کو للکارا: ﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ﴾ (طٰہٰ:۴۷) اور ﴿اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَائِیْلَ ﴿۱۷﴾﴾ (الشعراء) فرعون جو قومِ یہود پر ظلم روا رکھتا تھا یعنی ان کے بچے ذبح کرواتا اس کی وجہ بھی اس کا وہ خواب تھا جس کی رو سے ایک بنی اسرائیلی بچہ اس کی حکومت کے لیے خطرہ بننے والا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو للکارا تو وہ فوراً معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا۔ اوّلاً تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا﴾ (طٰہٰ:۵۷) ''کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری زمین سے نکال دے؟'' پھر اپنی قوم کو مخاطب کیا: ﴿یُرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ﴾ (الشعراء:۳۵) ''یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال دے''۔ آخر کار وہ اپنے درباریوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر سب نے متفقہ طور پر یہی واویلا کیا: ﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَیَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی ﴿۶۳﴾﴾ (طٰہٰ) ''وہ بولے بے شک یہ دونوں جادوگر چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری زمین سے اپنے جادو کے بل پر نکال دیں اور تمہارے مثالی طریقہ و تہذیب کو تباہ کر دیں''۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کو تباہ کیا اور یہود کو آزادی ملی اور اللہ نے اس کو اپنا احسان قرار دیا: ﴿وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۵﴾﴾ (القصص) ''اور ہم نے ارادہ کیا کہ اس قوم پر احسان کریں جس کو زمین میں دبا لیا گیا تھا اور ان کو حکمران اور زمین کا وارث بنا دیں''۔ بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بزدل قوم کو جہاد کا حکم دیا تاکہ بیت المقدس پر قبضہ کر لے: ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (المائدۃ) لیکن اس قوم نے حملہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس شہر میں بڑے طاقتور لوگ ہیں، جب تک وہ نہ نکلیں ہم داخل نہ ہوں گے۔ پس اے موسیٰؑ تم اور تمہارا خدا جا کے لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں!

اس پر اللہ کے نبیؑ نے فریاد کی، جس کے نتیجے میں ان پر ارضِ مقدس حرام کر دی گئی اور چالیس سال تک صحرائے تیہہ کی آوارہ گردی کی سزا دی گئی۔ سوچنے کی بات ہے کہ اللہ نے اس ''ترکِ جہاد کے فیشن میں آئی ہوئی قوم'' کو سزا کیوں دی؟ دوسری بار انہوں نے از خود یہ انتہا پسندی اختیار کی تو اللہ نے نہ صرف ان کی فرمائش کے مطابق سپہ سالار مقرر فرمایا بلکہ خوش ہو کر تابوتِ سکینہ بھی لوٹا دیا اور فتح بھی عطا فرمائی اور اہم جنگی کارنامہ سرانجام دینے والے داؤد (علیہ السلام) کو نبی بنا دیا، جنہوں نے بعد میں ایک عظیم یہودی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اسی سلطنت پر بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں حملہ کیا۔ ان کا جرم وہی تھا جو آج ہم نے روا رکھا ہے جس کا ذکر سورۃ المائدۃ میں بایں الفاظ کیا گیا: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ﴿۴۵﴾﴾ (المائدۃ) ''جو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں''۔ دوسری بار کا عذاب بھی ان کے شریعت کو مذاق بنانے اور قتلِ انبیاء کے سبب آیا' لیکن وہ انبیاء کرام علیہم السلام سیاسی غلبے سے روکنے کی وجہ سے قتل کیے گئے' بلکہ حکم بما انزل اللہ یعنی دین کے نفاذ کا حکم دینے کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران:۲۱) ''وہ قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق اور ان لوگوں کو بھی جو عدل وقسط کا حکم کرتے تھے''۔ حاصل یہ کہ سیاسی غلبے کی کوشش کرنا نہ تو موجب عذاب ہے اور نہ یہودیوں کے ساتھ مماثلت' بلکہ انبیائے یہود سے مماثلت ضرور ہے' کیونکہ ((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ))(۱) ''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کیا کرتے تھے۔''

اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے:''لَمَا يَزَعُ السُّلْطَانُ النَّاسَ اَشَدَّ مِمَّا يَزَعَهُمُ الْقُرْآنُ''(۲) ''خلیفہ لوگوں کو جس قدر (برائیوں سے) روکتا ہے' وہ اس سے زیادہ ہے جس قدر قرآن ان کو روکتا ہے۔'' ظاہر ہے ظالم کی سرکوبی صرف قرآن سے ممکن نہیں جب تک سلطان یعنی غلبہ حاصل نہ ہو۔ ضرورت یہ ہے کہ ایک منظم تحریک برپا کر کے اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہی اسلامی حکومت ایک طرف تو حدود اللہ کو نافذ کرے گی اور دوسری طرف اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے میڈیا کو اپنے کنٹرول میں کر کے قرآن وسنت کی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے استعمال کرے گی۔ اس دوطرفہ عمل ہی کے نتیجے میں اسلام کا فروغ ممکن ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

(۲) تاریخ المدینة المنورة لابن شبة النمیری متوفی ۲۶۲ھ: ۲/۱۶۰' دار الفکر' بیروت۔

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 25 روپے